

2

ٹھنڈا گوشت

﴿افسانے﴾

سعادت حسن منٹو

ٹھنڈا گوشت

افسانے

سعادت حسن منٹو

□

زحمت مہر درخشاں

بہمی چھوڑ کر اچی سے ہوتا ہوا غالباً سات یا آٹھ جنوری ۱۹۴۸ء کو یہاں لاہور پہنچا۔ تین مہینے میرے دماغ کی عجیب و غریب حالت رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا، میں کہاں ہوں۔ بہمی میں ہوں، کراچی میں اپنے دوست حسن عباس کے گھر بیٹھا ہوں یا لاہور میں ہوں جہاں کئی ریستورانوں میں قائد اعظم فنڈ جمع کرنے کے سلسلے میں رقص و سرود کی محفلیں اکثر جمتی تھیں۔

تین مہینے تک میرا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پردے پر ایک ساتھ کئی فلم چل رہے ہیں۔ آپس میں گڈمڈ۔۔۔۔۔ کبھی بہمی کے بازار اور گلیاں، کبھی کراچی کی چھوٹی چھوٹی تیز رفتار ٹرامیں اور گدھا گاڑیاں اور کبھی لاہور کے پر شور ریستوران۔۔۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا میں کہاں ہوں۔۔۔۔۔ سارا سارا دن کرسی پر بیٹھا خیالات میں کھویا رہتا۔ آخر ایک دن چونکا کیوں کہ جو روپیہ میں بہمی سے اپنے ساتھ لایا تھا، کچھ تو گھر میں اور کچھ گھر سے کچھ دور کلفٹن بار میں جذب ہو چکا تھا۔ اب مجھے قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ میں لاہور میں ہوں۔ جہاں کبھی کبھی میں اپنے مقدمات کے سلسلے میں آیا کرتا تھا اور کرنل شاپ سے بہت سے خوبصورت چپل خرید کر اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔

میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا کام کیا جائے۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ تقسیم کے بعد فلمی کاروبار قریب قریب مفلوج ہو چکا ہے، جن فلم کمپنیوں کے بورڈز نظر آتے ہیں، وہ ان بورڈوں ہی تک محدود ہیں۔ بہت تشویش ہوئی۔ الاٹمنٹوں کا بازار گرم تھا۔ مہاجر اور غیر مہاجر دھڑا دھڑا اپنے اثر و رسوخ سے کارخانے اور دکانیں الاٹ کر رہے تھے۔ مجھے بھی مشورہ دیا گیا، مگر میں نے اس لوٹ کھسوٹ میں حصہ نہ لیا۔

انہی دنوں معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض اور چراغ حسن حسرت مل کر ایک روز نامہ جدید خطوط پر شائع کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ میں ان حضرات سے ملا۔ اخبار کا نام ”امروز“ تھا جو آج ہر ایک کی زبان پر ہے۔ پہلی ملاقات پر اخبار کی ”ڈی“ تیار کی جا رہی تھی۔ دوسری ملاقات ہوئی تو امروز کے غالباً چار پرچے نکل چکے تھے۔ اخبار کی گٹ اپ دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ طبیعت میں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ لکھوں۔ لیکن جب لکھے بیٹھا تو دماغ کو منتشر پایا۔ کوشش کے باوجود ہندوستان کو پاکستان سے اور پاکستان کو ہندوستان سے علیحدہ نہ کر سکا۔ بار بار دماغ میں یہ الجھن پیدا کرنے والا سوال گونجتا، کیا پاکستان کا ادب علیحدہ ہوگا۔ اگر ہوگا تو کیسے ہوگا؟ وہ سب کچھ جو سالم ہندوستان میں لکھا

گیا تھا اس کا مالک کون ہے، کیا اس کو بھی تقسیم کیا جائے گا۔ کیا ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے بنیادی مسائل ایک جہت سے نہیں۔ کیا ادھر اردو بالکل ناپید ہو جائے گی۔ یہاں پاکستان میں اردو کیا شکل اختیار کرے گی۔ کیا ہماری اسٹیٹ مذہبی اسٹیٹ ہے۔ اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت میں وفادار رہیں گے مگر کیا ہمیں حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہوگی۔ آزاد ہو کر کیا یہاں کے حالات فرنگی عہد حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے۔

گرد و پیش جدھر میں نظر ڈالتا تھا، انتشار ہی انتشار دکھائی دیتا تھا۔ کچھ لوگ بے حد خوش تھے کیونکہ ان کے پاس ایک دم دولت آگئی تھی۔ لیکن اس خوشی میں بھی انتشار تھا جیسے وہ بکھر کر ایک دن ہوا ہو جانے والی ہے۔ اکثر مغموم و متفکر تھے کیونکہ وہ لٹ پٹ کر آئے تھے۔ مہاجرین کے کیمپ دیکھے۔ یہاں خود انتشار کے روگنئے کھڑے دیکھے۔ کسی نے کہا اب تو حالات بہت بہتر ہیں، کچھ عرصہ پہلے کی حالت دیدنی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر یہ حالت کی بہتر ہے تو ابتری معلوم نہیں کیسی ہوگی۔ غرض کہ عجیب افراط و تفریط کا عالم تھا۔ ایک کا قبضہ دوسرے کی آہ سے دست و گریباں تھا۔ ایک کی زندگی دوسرے کے عالم نزع سے مصروف پیکار تھی۔ دودھارے بہ رہے تھے۔ ایک زندگی کا دھارا۔ ایک موت کا۔ ان کے درمیان خشکی تھی جس پر گرنگی، شکم سیری و بلا نوشی ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔

فضا پر مردنی طاری تھی۔ جس طرح گرمیوں کے آغاز میں آسمان پر بے مقصد اڑتی ہوئی چیلوں کی چینیں اداس ہوتی ہیں، اسی طرح پاکستان زندہ باد اور قائد اعظم زندہ باد کے نعرے بھی کانوں کو اداس اداس لگتے تھے۔

ریڈیو کی لہریں اقبال مرحوم ایک آہنگ کلام شب و روز اپنے کاندھوں پر اٹھا اٹھا کر تھک اور اکتا گئی تھیں۔ فیچر پروگرام کچھ اس قسم کے ہوتے تھے کہ مرغیاں کس طرح پالی جاتی ہیں، جوتے کیسے بنائے جاتے ہیں، فنن و باغت کیا ہے، ریلفو جی، کیمپوں میں کتنے آدمی آئے اور کتنے گئے۔

قریب قریب تمام درخت ننگے بچے تھے۔ سردیوں سے بچنے کے لیے غریب مہاجرین نے ان کی چھال اتار کر اپنی کھال گرم کی تھی۔ شہنیاں کاٹ کر پیٹ کی آگ ٹھنڈی کی تھی۔ ان ننگے بچے درختوں سے فضا اور بھی دل شکن حد تک اداس ہو گئی تھی۔

بلڈنگوں کی طرف دیکھتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا سوگ میں ہیں۔ ان کے مکین بھی ماتم زدہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے، کھیلتے تھے، کوئی کام مل جاتا تھا تو وہ بھی کرتے تھے۔ مگر گویا یہ سب کچھ خلا میں ہو رہا تھا۔ ایک ایسے خلا میں جو لبالب ہونے پر بھی خالی تھا۔

میں اپنے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی سے ملا۔ ساحر لدھیانوی سے ملا۔ ان کے علاوہ اور لوگوں سے ملا۔ سب میری طرح ذہنی طور پر مفلوج تھے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ جو اتنا زبردست بھونچال آیا ہے۔ شاید اس کے کچھ جھکے آتش فشاں پہاڑ میں اٹکے ہوئے تھے۔ باہر نکل آئیں تو فضا کی نوک پلک درست ہوگی۔ پھر صحیح طور پر معلوم ہو سکے گا کہ صورت حالات کیا ہے۔

کے بعد وہ کچھ نہ بولے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”کیسا ہے؟“

□

قاسمی صاحب پر افسانے کا اثر ابھی تک غالب تھا۔ مختصراً کہا۔ ”اچھا ہے۔۔۔۔۔۔ میں لیے جاتا ہوں۔“ اور آپ رخصت لے کر چلے گئے۔

”کھول دو“ قاسمی صاحب کے پرچے ”نقوش“ میں شائع ہوا۔ قارئین نے پسند کیا۔ ہر ایک کا رد عمل یکساں تھا۔ آخری سطور سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھیں۔ لیکن ایک دم ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا حادثہ وقوع پذیر ہوا۔ حکومت کو یہ افسانہ امن عامہ کے مفاد کے منافی نظر آیا، چنانچہ حکم ہوا ”نقوش“ کی اشاعت چھ مہینے تک بند رہے۔ اخباروں میں حکومت کے اس اقدام کے خلاف احتجاجاً بہت کچھ لکھا گیا مگر اتنا ہی حکم اپنی جگہ پر قائم رہا۔

میں نے ایک روز قاسمی صاحب سے مسکرا کر کہا۔ ”اگر آپ ”ٹھنڈا گوشت“ شائع کرتے تو شاید یہ بجلی آپ کے آشیانے پر نہ گرتی۔“ کافی دن گزرنے پر ”ادب لطیف“ کے نائب مدیر میرے پاس آئے اور ”ٹھنڈا گوشت“ لے گئے۔ افسانے کی کتابت ہو گئی۔ کاپیاں جم گئیں۔ پروف نکل آئے۔ غلطیاں درست کر کے جب واپس پریس میں گئیں تو کسی کی نظر ”ٹھنڈا گوشت“ والی کاپی پر پڑی۔ اس نے افسانہ پڑھا تو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ قہر درویش برجان درویش اس افسانے کے بغیر ہی پرچہ شائع کیا گیا۔

چودھری برکت علی صاحب کو سب میں تھے۔ واپس آئے تو انہوں نے ”ادب لطیف“ کے دوسرے شمارے میں ”ٹھنڈا گوشت“ چھپوانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ افسانے کا مسودہ مجھے واپس دے دیا گیا۔

اس دوران میں کراچی سے ممتاز شیریں کے متعدد خط آچکے تھے کہ میں ان کے ”نیا دور“ کے لیے کوئی افسانہ بھیجوں۔ میں نے اٹھا کر ”ٹھنڈا گوشت“ ان کو روانہ کر دیا۔ کافی دیر کے بعد جواب آیا کہ ہم دیر تک سوچتے رہے کہ اسے شائع کیا جائے یا نہیں۔ افسانہ بہت اچھا ہے، مجھے بہت پسند ہے لیکن ڈر ہے کہ حکومت کے احتساب کے شکار نہ ہو جائیں۔ ”ٹھنڈا گوشت“ یہاں سے بھی ٹھنڈا ہو کر واپس میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے سوچا اب اسے کسی رسالے میں نہیں چھپوانا چاہیے۔

چھ مہینے کی عدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ حکومت نے ”نقوش“ پر سے ”نہ چھا پو“ والی قید ہٹا دی۔ چنانچہ میں نے ”نیا ادارہ“ کے لیے ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا عنوان میں نے ”نمرود کی خدائی“ رکھا۔ اس میں ”کھول دو“ کے ساتھ ”ٹھنڈا گوشت“ بھی شامل کر دیا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا عزیز ی عارف عبدالمتمین رسالہ ”جاوید“ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ تو آپ میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں ان کو ”ٹھنڈا گوشت“ کا مسودہ اشاعت کے لیے دوں۔ کافی دیر میں نے ٹال مٹول کی مگر آخر کار ان کے پیہم اصرار پر میں نے ”نیا ادارہ“ کے مالک چودھری نذیر احمد صاحب کو ایک چٹ لکھ دی کہ یہ ”جاوید“ والے اپنا پرچہ ضبط کرانا چاہتے ہیں۔ براہ کرم ان کو ”ٹھنڈا گوشت“ کا مسودہ

دے دیجئے۔ عارف صاحب افسانے کا مسودہ لے آئے اور اسے ”جاوید“ کے خاص نمبر مطبوعہ مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع کر دیا۔

پرچہ چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا۔ اندرونی اور بیرونی ایجنسیوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہاں تک تو خیریت رہی۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ ”ٹھنڈا گوشت“ پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ مگر پریس برانچ کی باگیں ابھی تک چودھری محمد حسین کے ہاتھ میں تھیں۔ گوضیفی کے باعث ان کے ہاتھ بہت کمزور ہو چکے تھے مگر انہوں نے زور کا ایک جھنکا دیا اور پولیس کی مشینری حرکت میں آ گئی۔

میں نے ایک روز اڑتی اڑتی سنی کہ چھاپہ پڑا ہے اور پولیس ”جاوید“ کے خاص نمبر کے پرچے اٹھا کر لے گئی ہے۔ میں نے جان پہچان کے چند لوگوں سے پوچھا۔ کسی نے اس خبر کی تصدیق کی۔ کسی نے کہا۔ ”اجی ہٹائیے یہ جاوید والوں کا پہلی اسٹنٹ ہے۔“ اس دوران میں ”جاوید“ کے مالک مسٹر نصیر انور کا رقعہ ملا۔

منٹو صاحب!

ایک خبر سنئے۔۔۔۔۔ آج پولیس نے دفتر ”جاوید“ پر چھاپہ مارا۔ تلاشی لینے پر بچے کچھ چند پرچے اپنے قبضے میں لے لیے۔ باقی پرچوں کی جانچ پڑتال ہوئی تو ڈسٹرکٹ رجسٹر نے واضح کر دیا کہ تمام پرچے ہندو پاک کے مختلف اسٹیشنوں پر سپلائی ہو چکا ہے۔

رجسٹر میں سے تمام ایجنسیوں کے پتے نوٹ کر لیے گئے اور آئندہ سپلائی کا حساب کتاب بند کر دیا گیا۔ یہ کارروائی گرفتاری کا پیش خیمہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلد ہی ملازموں کے کنٹریں میں ہوں گے۔ لیکن ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ ایک مقامی ادارہ اس چھاپے کو اختراع اور پروپیگنڈے سے منسوب کرتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیوں ہے۔

خیر اس کی تصویق خود بخود ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ اب ذرا وہیں چلئے جہاں تین بار سزا پانے پر آپ بری قرار دیئے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بار آخری بار ہوگی۔

خبر کی تصدیق ہو گئی۔ معاملہ پریس ایڈوائزرز بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ جس کے کنویز کرل فیض احمد فیض ایڈیٹر ”پاکستان نامگز“ تھے۔ اس میں ”جاوید“ کے مالک مسٹر نصیر انور بھی موجود تھے۔ ان کی زبانی اس میٹنگ کی مختصر روداد سنئے۔ پاکستان نامگز کے دفتر میں پریس ایڈوائزرز بورڈ کی میٹنگ تھی۔ فیض احمد فیض کنویز تھے۔ میٹنگ میں ایف ڈبلیو بسٹن (سول ملٹری گزٹ) مولانا اختر علی (زمیندار) حمید نظامی (نوائے وقت) وقار انبالوی (سفینہ) اور امین الدین صحرائی (جدید نظام) شریک تھے۔ چودھری محمد حسین نے ”جاوید“ کا خاص نمبر پیش کیا۔ آپ نے سب سے پہلے پرچے کے باغیانہ اور اشتعال انگیز مضامین نظم و نثر گنوائے۔ ”غلامی سے آزادی تک“ ”رقص بسمل“ ”سیلاب چین“ یہ تھیں نظمیں۔ مضامین میں سے ”لورینگ سے فلیٹی تک“۔۔۔۔۔

”کھیڑا بہادر کی بے“ اور ”چین کتنی دور ہے“ زیر بحث لائے گئے۔ فیض حکومت کے عائد کردہ الزام کی تردید کرتے رہے۔ دیگر اراکین

نے ہاں میں ہاں ملائی اور یوں یہ سیاسی الزام مل گیا۔ لیکن نزلہ گرا ”ٹھنڈا گوشت“ پر۔ فیض صاحب نے جب اسے غیب نش قرار دیا تو مولانا اختر علی گرج اٹھے۔ ”نہیں نہیں، اب ایسا ادب پاکستان میں چلے گا۔“ جناب صحرائی نے اس پر صا د کیا۔ وقار صاحب نے اس افسانے کو ملعون و مطعون قرار دیا۔ حمید نظامی نے نوائے وقت کا ساتھ دیا اور جب ایف ڈبلیو بسٹن کو چودھری صاحب نے انگریزی میں ”ٹھنڈا گوشت“ سمجھایا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ فرمانے لگے۔ ”اس کہانی کی تھیم یہ ہے کہ ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں کہ سکھوں نے ہماری مردہ لڑکی تک نہیں چھوڑی۔“ مجھے ہنسی تو آگئی تھی لیکن جب چودھری صاحب غلط ترجمانی پر مصر رہے تو مجھے افسوس ہوا۔ میں نے لاکھ سمجھایا۔ فیض صاحب نے بھی ہر طرح سے اطمینان دلایا۔ لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ اب عدالت ہی اس کا فیصلہ کرے۔

چنانچہ چند دن بعد میں نصیر انور اور عارف عبدالمتین گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتار کرنے والے سب انسپکٹر چودھری خدا بخش تھے۔ بے حد شریف۔ کئی دن میرے مکان کے چکر کاٹتے رہے۔ ان دنوں میں اکثر باہر ہوتا۔ آخر ایک روز وہ مجھ سے ملنے میں کامیاب ہو گئے۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کہا۔ ”کل صبح کسی دوست کے ساتھ تھانہ سول لائنز میں تشریف لے آئے گا تاکہ آپ کی ضمانت ہو جائے۔“ اس سے پہلے کئی مرتبہ مجھے پولیس کے آدمیوں سے پالا پڑ چکا تھا۔ چودھری خدا بخش صاحب کا نرم رویہ مجھ پر بہت اثر انداز ہوا۔ دوسرے روز صبح کو میں تھانے میں حاضر ہو گیا۔ میرے دوست شیخ سلیم نے دستخط کیے اور ہم مقدمے کے پہلے مرحلے سے فارغ ہو گئے۔

عارف عبدالمتین بہت ہی پریشان تھے۔ ان کا حلق خشک ہو جاتا تھا۔ یہ حیرت کی بات ہے کیونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ عدالت سے خدا معلوم کیوں اتنے خائف تھے۔ بہر حال سمن جاری ہوئے۔ سماعت کی تاریخ مقرر ہوئی اور ہم تینوں ضلع میں حاضر ہوئے۔

میرے لیے یہ جگہ کوئی نئی نہیں تھی۔ اپنے پچھلے تین مقدموں کے سلسلے میں یہاں کئی مرتبہ آچکا تھا اور دھول پھانک چکا تھا۔ نام تو ضلع کچھری ہے لیکن بے حد غلیظ جگہ ہے۔ مچھر، کھیاں، کیڑے مکوڑے۔۔۔۔۔۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکاریں، نہایت ہی دقیانوس ٹائپ رائٹروں کی اکتا دینے والی ٹپ ٹپ۔ تین ٹانگوں والی کرسیاں جن کی نشست کا بید ہی غائب ہے۔ دیواروں پر سے پلستر اکھڑ رہا ہے۔ باغ ہے جس کا لان افلاس زدہ میلے کپیلے کشمیری کے سر کی طرح گنجا ہے۔ برقع پوش عورتیں ننگے گرد سے اٹے ہوئے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہیں۔ کوئی گندی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی بسور رہا ہے۔ اندر کمروں میں مجسٹریٹ صاحبان نہایت ہی واہیات میزوں کے پاس بیٹھے مقدموں کی سماعت فرما رہے ہیں۔ پاس دوست یا ریٹھے ہیں۔ دوران سماعت میں ان سے بھی گفتگو جاری ہے۔

الفاظ ضلع کچھری کی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ یہاں کی فضا الگ۔ یہاں کا ماحول الگ۔ یہاں کی زبان الگ۔ یہاں کی اصطلاحات

رکھی طور پر پیش کئے گئے۔

21

سید ضیاء الدین نے کہا کہ میری رائے میں ”ٹھنڈا گوشت“ تمام کا تمام فحش ہے۔ میاں خالد کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جہاں تک مصنف کی کوشش کا تعلق ہے وہ نیک ہے مگر انداز اظہار اور استعمال الفاظ غلط ہے۔ میاں خالد نے گواہ سے ایک اور سوال کیا۔ ”کیا مصنف کو اپنے کردار کے منہ میں ایسے الفاظ نہیں ڈالنے چاہئیں جو اس کی صحیح شخصیت پیش کریں۔“ سید صاحب نے جواب دیا۔ ”جس قسم کا کردار ہو ویسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔“ آپ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مصنف کا یہ کام ہے کہ وہ اچھے برے کردار کو تخلیق کرے۔

شہادت استغاثہ ختم ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے حسب ضابطہ رکھی طور پر ہم سے چند سوال کئے جن کا مختصر جواب دے دیا گیا۔ یہ سلسلہ عدالتی زبان میں ”افسار ملزم بلا حلف“ کہلاتا ہے اور کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔

سوال عدالت: آپ پر الزام ہے کہ آپ نے بحیثیت مصنف مضمون ”ٹھنڈا گوشت“ جو کہ رسالہ ”جاوید“ کے خاص نمبر میں بغرض اشاعت نصیر انور پرنٹر و پبلشر ملزم ہمراہی اور عارف عبدالمستین اور نصیر انور ایڈیٹر رسالہ مذکورہ کو جو کہ فحش تھا دیا۔ یہ جرم زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند کی تعریف میں آتا ہے آپ وجہ ظاہر کریں کہ کیوں نہ آپ کو اس جرم کی سزا دی جائے؟

جواب: (جو خالد صاحب نے میری طرف سے دیا) میں نے افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ رسالہ ”جاوید“ میں بغرض اشاعت دیا۔ لیکن وہ فحش نہیں تھا اور نہ میں اسے فحش تصور کرتا ہوں۔ یہ افسانہ اصلاحی ہے۔

سوال عدالت: مقدمہ کیوں بنایا گیا؟

جواب: پولیس بہتر جانتی ہے۔ اس کا نقطہ اخلاق و اصلاح ہم سے مختلف ہے۔

سوال عدالت: کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟

جواب: اس موقع پر نہیں۔

اب ہم سے صفائی کے گواہوں کی فہرست پیش کرنے کے لیے کہا گیا۔ فہرست ہم نے پہلے ہی سے تیار کر رکھی تھی؛ چنانچہ فوراً پیش کر دی گئی۔ میاں سعید صاحب نے جب بتیس نام دیکھے تو خفا ہو گئے۔ کہا۔ ”میں اتنا جہوم نہیں بلا سکتا۔“ میاں خالد نے اصرار کیا کہ ہر گواہ اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ میاں سعید نے اپنے انداز میں مضحکہ اڑانے کی کوشش کی۔ ممتاز شیریں صاحبہ کا نام پڑھا تو ارشاد کیا۔ ”یہ ممتاز شانتی کون ہے؟“ عدالت کے آدمی میاں صاحب کے اس مذاق پر ہنسے۔ ہم ہونٹ بھیجنے خاموش رہے۔

بڑی مشکلوں کے بعد مجسٹریٹ صاحب درجہ اول چودہ گواہ بلانے پر راضی ہوئے؛ چنانچہ فہرست پر نشان لگا دیئے گئے۔ سمن جاری

ہوئے۔ میں کسی گواہ سے نہ ملا کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ ہر ایک میرے افسانے کے متعلق اپنی بے لاگ رائے دے تاکہ مجھے اپنی صحیح پوزیشن معلوم ہو سکے۔

جن گواہوں کے سمن کی تعمیل ہو چکی تھی ان کو صبح سویرے عدالت میں حاضر ہونا پڑا تھا۔ میں بے حد شرمندہ تھا کیونکہ غریب کام کاج چھوڑ کر کئی گھنٹے کھڑے رہتے تھے۔ ہم تو ملزم تھے، لیکن ان کی حالت بھی ہم جیسی تھی۔ ہم اندر کٹھنرے میں کھڑے رہتے تھے اور وہ عدالت کے باہر لوہے کے جنگلے کے ساتھ لگے انتظار کرتے رہتے تھے کہ انہیں کب آواز پڑتی ہے۔

میرے دوست شیخ سلیم کی حالت قابل رحم تھی۔ صبح شام پینے کا عادی۔ سارا وقت جمائیاں لیتا رہتا تھا۔ آخر اس سے یہ اذیت برداشت نہ کی گئی۔ چھوٹی بوتل میں دہسکی بھر کے لے آتا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پیتا رہتا۔ ادب سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن جب وہ دوسروں سے باتیں کرتا تو یہی کہتا۔ ”آخر فاشی ہے کیا؟ منٹو کا افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ میں نے پڑھا نہیں، لیکن یہ فحش نہیں ہو سکتا۔ منٹو آرٹسٹ ہے۔“

ہماری طرف سے پہلے گواہ سید عابد علی عابد ایم اے ایل ایل بی پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے رسالہ جاوید میں ”ٹھنڈا گوشت“ پڑھا ہے۔ یہ ایک ادب پارہ ہے۔ منٹو صاحب کی میں نے تمام تصانیف پڑھی ہیں۔ پریم چند کے بعد جو مختصر افسانہ نگار مشہور ہوئے ان میں سعادت حسن منٹو کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس افسانے سے ایشر سنگھ کے کردار کا نمایاں ترین اثر یہ ہے کہ اس نے جو ناروا حرکت کی اس کی سزا سے فطرت کی طرف سے نفسیاتی نامردی کی صورت میں مل گئی۔“

عدالت کے ایک سوال پر عابد صاحب نے کہا۔ ”ولی سے لے کر غالب تک سب وہ چیز جسے فحش کہا جاتا ہے لکھتے چلے آئے ہیں۔ لٹریچر کبھی فحش نہیں ہوتا جو ایک بار لٹریچر قرار دیا جا چکا ہو۔“

استغاثے کی طرف سے سوال کیا گیا۔ ”کیا ادب مقصود بالذات ہے؟“

عابد صاحب نے جواب دیا۔ ”میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ادب تنقید حیات ہے اور اس میں اس سوال کا جواب شامل ہے۔ ہر معقول انسان کے قول اور فعل کا مطلب ہوتا ہے لیکن تمام انسان معقول نہیں ہوتے۔ ہر قول یا فعل سوسائٹی کی نظروں میں اچھا یا برا ہو سکتا ہے۔ اچھے اور برے فعل جانچنے کے لیے بے شمار معیار ہوتے ہیں۔“

استغاثے کے ایک اور سوال کے جواب میں عابد صاحب نے کہا۔ ”یہ افسانہ میرے سب بچوں اور بچیوں نے پڑھا ہے۔ میری ایک لڑکی فورٹھ ایئر میں پڑھتی ہے۔ اس سے کئی بار ”سیکس“ پر علمی بحث ہو چکی ہے جو اس کے نصاب کا جزو ہے۔“ پھر آپ نے کہا۔ ”خاص آدمیوں سے جو کہ ادیب ہیں اس افسانے کے بارے میں میرا تبادلہ خیالات ہوا۔ سب نے اس کو بہت سراہا۔“

صفائی کے دوسرے گواہ مسٹر احمد سعید پروفیسر نفسیات دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ ”ٹھنڈا گوشت“ فحش نہیں ہے۔ اس میں ایک بہت بڑا جنسی مسئلہ ہے۔ ان کے نزدیک لفظ فحش کی کوئی بنیاد ہی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں فحشی ایک اضافی چیز ہے۔ ذہنی طور پر بیمار اشخاص پر ”ٹھنڈا گوشت“ پڑھنے سے برا اثر ہو سکتا ہے۔

تیسرے گواہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی سابق ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کشمیر تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا۔ ”انسانی نفسیات کے اندر جو خیر و شر ہے، ادیب کا یہ کام ہے کہ وہ اس کو اس انداز سے پیش کرے جس سے انسانی زندگی کے حقائق سمجھنے میں مدد مل سکے۔ برے کردار کو اس انداز سے پیش کرے کہ اس کی برائی دیکھ کر نفرت پیدا ہو۔“

خلیفہ صاحب نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ زیر بحث افسانے کے کردار ایشر سنگھ سے شدید کراہت اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کردار بالکل صحیح ہے۔ ایسے کرداروں پر خاص کیفیتوں کے ماتحت جسمانی حالت درست ہونے کے باوجود نفسیاتی نامردی طاری ہو سکتی ہے۔

ان تین گواہوں کے بیان ایک پیشی میں ہوئے۔ چونکہ یہ خاصے طویل تھے اور اس کا ایک ایک لفظ خود مجسٹریٹ صاحب کو لکھنا پڑتا تھا اس لیے وہ جھنجھلا جھنجھلا جاتے تھے۔ کئی بار آپ نے تنگ آ کر کہا۔ ”میں مجسٹریٹ ہوں یا محرر؟“ لیکن بہر حال انہیں اپنا فرض ادا کرنا ہی پڑتا تھا۔

اس پیشی میں ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ میرے ہاتھوں میں سگریٹوں کا ڈبہ غالباً کر یون اے کا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کی نظر پڑی تو آپ نے مجھے ایک بہت بڑی ڈانٹ پلائی۔ ”یہ گھر نہیں ہے عدالت ہے۔“ میں نے مودبانہ عرض کیا۔ ”لیکن حضور! میں پی تو نہیں رہا ہوں۔“

آپ نے اور زیادہ گرم ہو کر کہا۔ ”خاموش رہو ڈبہ اپنی جیب میں رکھو۔“ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ مجسٹریٹ صاحب درجہ اول نے میز پر سے اپنا سگریٹ ٹن اٹھایا اور ایک سگریٹ لگا کر پینا شروع کر دیا۔ اور میں مضمون کے کٹہرے میں کھڑا اس کا بکھرا ہوا دھواں پیتا رہا۔ اگلی پیشی پر میاں تصدق حسین خالد تشریف نہ لائے کیونکہ ان کے گھر میں کوئی علییل تھا۔ ہمیں تاریخ مل گئی۔ اس تاریخ پر میاں صاحب موصوف تشریف نہ لائے۔ ان کا لڑکا ولایت سے واپس آ رہا تھا۔ وہ کراچی اس کے استقبال کے لیے چلے گئے تھے۔ ہم سخت الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ میں نے مجسٹریٹ صاحب سے مودبانہ گزارش کی کہ ہمیں تاریخ دے دی جائے۔ اس لیے کہ ہمارا وکیل وجود نہیں۔ آپ نے اس سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ کارروائی شروع ہو۔

میں بہت شپٹا یا۔ گواہ کو آواز دی۔ ڈاکٹر سعید اللہ ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی وی ایس سی (ان دنوں پاکستان ایئر فورس کے

سولین آفیسر) تشریف لائے۔ اب میں سوچنے لگا کیا کروں۔ مگر شاید اس لیے کہ خاندان کے سب بزرگ وکیل اور پاپ سب نج تھے، دو بڑے بھائی بیرسٹر ہیں اور اس لحاظ سے خون میں کسی قدر قانون گھلا ہوا تھا، میں نے میاں تصدق حسین خالد کی جگہ سنبھال لی اور اپنے گواہ نمبر ۴ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب سے بیان دلوانا شروع کر دیا۔ بات بات پر مجسٹریٹ صاحب مجھے ٹوکتے۔ ”تم اس طرح سوال نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ تم یہ بات نہیں پوچھ سکتے۔“ میں ڈنارہا۔

ڈاکٹر صاحب کا بیان آدھا ختم ہوا کہ عدالت کے کمرے میں چار نوجوان وکیل کالے کوٹ پہنے بڑے چست، بڑے ہانکے داخل ہوئے اور ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ایک جس کی پتلی پتلی موٹھی تھیں اور جس کا رنگ باقی دو کے مقابلے میں کسی قدر سانا لانا تھا، میرے ساتھ کٹہرے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب مجھے سانس لینے کا موقع ملا تو اس نے میرے کان میں کہا۔ ”منٹو صاحب! کیا ہم آپ کے مقدمے کی پیروی کر سکتے ہیں؟“ میں نے کچھ نہ سوچا اور کہا۔ ”جی ہاں! آپ کر سکتے ہیں۔“ چنانچہ پتلی موٹھیوں والے اس نوجوان وکیل نے پیروی شروع کر دی۔

”مجسٹریٹ صاحب نے اس سے پوچھا۔ ”آپ کیسے؟“

وکیل نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”حضور! میں ان کا وکیل ہوں۔ کیوں منٹو صاحب؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کارروائی شروع ہوئی۔ اس وکیل کے باقی تین ساتھی بھی حصہ لینے لگے۔ ان کی سرگرمی میں بڑا دلکش لڑکین تھا، وہ جو کالج کے زندہ دل طلبہ میں ہوتا ہے۔ مجسٹریٹ بھنا گئے۔ آپ نے ان تین سے پوچھا۔ ”آپ حضرات کیوں بیچ میں بول رہے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”حضور، ہم ملزموں کے وکیل ہیں۔ کیوں منٹو صاحب؟“

میں نے پہلے کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر سعید اللہ صاحب نے اپنے بیان میں جو کچھ کہا، میں اسے مختصر آپیش کرتا ہوں۔

آپ نے فرمایا ”ٹھنڈا گوشت“ پڑھنے کے بعد میں خود ٹھنڈا گوشت بن گیا ہوں۔ پڑمردگی اور افسردگی۔ یہ تھا اس کا اثر۔ یہ افسانہ شہوانی ہیجان ہرگز پیدا نہیں کرتا۔ ایئر سگھ کا کردار پیش کرنے کے لیے مصنف نے دو تین دفعہ گالی استعمال کی ہے، مگر شاید فنکار نے اسے مناسب سمجھا ہو۔ مگر گالی کی شکل اس نے اس طرح بدلی ہے کہ گالی معلوم نہیں ہوتی۔ اگر وہ گالی ایئر سگھ نے استعمال کی ہے، گالی بھی رہتی تو بھی میرے نزدیک افسانہ فحش نہ ہوتا۔ گالی فحش بھی ہو سکتی ہے اور فحش نہیں ہو سکتی۔ اگر فن کار صحیح فنکار ہے تو وہ گالی کو بغیر ضرورت کبھی استعمال نہیں کرتا۔ اس افسانے میں گالی کا استعمال فنکارانہ ہے۔“

پروسی کیوٹر صاحب بڑے نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ بڑے ہانکے، کج کلاہ، گردن میں ہلکا سا شاندار خم۔ آنکھوں پر ”رم لس“ چشمہ

صاف ظاہر تھا کہ اقبال صاحب کیا چاہتے تھے۔ صوفی صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ اس لیے کہ پڑھنے والوں کے اپنے ذہنی رجحانات شامل ہوں گے نہ کہ مصنف کا مطلب۔ تخلیق ادب مصنف اپنی طبع سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔ یہ تخلیق اوروں کے لیے بھی ہوتی ہے۔“

اقبال صاحب نے ایک اور سوال کیا۔ ”اگر اس تصنیف سے لوگوں کے اخلاق پر برا اثر پڑے تو اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوگی یا نہیں؟“

صوفی صاحب نے کھٹ سے جواب دیا۔ ”وہ بری الذمہ ہے۔“

اقبال صاحب نے عاجز آ کر پوچھا۔ ”آخر مخرب اخلاق تحریر کیا ہے؟“

صوفی صاحب نے جواب دیا۔ ”وہ تحریر جس سے لکھنے والے کا مقصد محض تخریب اخلاق ہو۔“

اقبال صاحب نے ناک پر اپنا ”رم لس“ چشمہ جمایا اور گردن کو ذرا اور خمیدہ کر کے جرح بند کر دی۔

ڈاکٹر آئی لطیف ہیڈ آف دی سائی کالوجی ڈیپارٹمنٹ ایف سی کالج لاہور بلائے گئے۔ میں نے ان کا نام سنا تھا لیکن دیکھا کبھی نہیں تھا۔ آپ صوفی صاحب کے بیان کے دوران میں میاں سعید صاحب کے پاس بیٹھے تھے اور رسالہ ”جاوید“ کا خاص نمبر ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ان کی طرف غور ہی نہیں کیا تھا۔ جب وہ بیان دینے لگے تو میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ کالا رنگ۔ سب سے پہلے مجھے ان کی تکیھی موٹھیں نظر آئیں۔ آپ نے رسالہ ایک طرف رکھا اور کہنا شروع کیا میں نے ”ٹھنڈا گوشت“ ابھی ابھی پڑا ہے۔ یہ ایک غلط رسالے میں چھپا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ افسانہ ایک پاپولر رسالے میں نہیں چھپنا چاہیے تھا۔ اگر یہ کسی سائنٹیفک رسالے میں کیس کی ہسٹری کے طور پر مردی اور نامردی کی تائید یا تردید میں چھپتا تو اس پر فحاشی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ جن الفاظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بولنے میں ان کو برا سمجھتا ہوں۔ لیکن کیس ہسٹری میں یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھیں گے۔“

خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ ڈاکٹر لطیف نے ایک دم پوچھا۔ ”مستر منٹوکون ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”جناب یہ خاکسار ہے۔“ ڈاکٹر صاحب کی تکیھی موٹھیں تھر تھرائیں۔ آپ نے مجھ سے کچھ نہ کہا اور بیان دینے میں مشغول ہو گئے۔ وکیل صاحب نے میرے کان میں کہا۔ ”منٹو صاحب! آپ کا یہ گواہ تو ہوسٹائل ہو گیا ہے۔ اب آپ اس پر جرح کر سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہٹائیے“

لیکن وکیل صاحب نے جرح کر ہی دی۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر لطیف صاحب نے کہا۔ ”افسانہ ایسے رسالے میں جس کو ہر بچہ بوڑھا لڑکا لڑکی پڑھ سکے نہیں چھپنا چاہیے تھا کیونکہ ایسی طباع جو جذبات کو مشتعل کرنے والے تاثرات قبول کرنے والی ہوں یہ افسانہ

پڑھ کر مشتعل ہوں گی۔“

21

جرح ختم ہوئی۔ ڈاکٹر لطیف صاحب میرے پاس آئے۔ ہاتھ ملایا اور کہا۔ ”آپ نے مجھے گواہی کے لیے بلایا تھا تو کم از کم مل لیے

ہوتے۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”انشاء اللہ ملاقات کا شرف حاصل کروں گا۔“

ڈاکٹر صاحب نے پھر ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

اب میں ان چار نو جوان و کیلوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو بڑے ڈرامائی انداز میں میرے مقدمے میں داخل ہوئے تھے۔ پتلی پتلی مونچھوں، تیکھی ناک اور سانولے رنگ والے شیخ خورشید احمد تھے۔ کافی ہاؤس ان کے بغیر نامکمل ہے۔ دوسرے تین تھے، مسٹر مظہر الحق، مسٹر سردار محمد اقبال اور مسٹر اعجاز محمد خان۔ آپ لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں خود اپنا کیس کنڈکٹ کر رہا ہوں اور پریشان ہوں تو وہ میری مدد کے لیے چلے آئے۔ میں نے ان کا شکر یہ مناسب و موزوں الفاظ میں ادا کیا۔ شیخ خورشید احمد نے کہا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن داد دیجئے کہ میں نے آپ کا افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ پڑھا کیا، دیکھا تک نہیں۔“

ہم سب خوب بنے۔ شیخ نے کہا۔ ”اور میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ مسٹر محمد اقبال نے بھی یہ افسانہ ابھی تک نہیں پڑھا۔“

ہماری طرف سے اب تک سات گواہ پیش ہوئے، بقایا گواہوں کو بلوانے کے لیے جب شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے درخواست کی تو مسٹر دردی گئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس خیال سے کہ ہمارا پلڑا وزنی ہے، عدالت کی طرف سے دو چار گواہ طلب کئے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی، شورش کاشمیری، ابوسعید بزمی اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔

کئی تاریخیں بھگتیں مگر یہ حضرات جمع نہ ہوئے۔ آخر ایک تاریخ پر سب آگئے۔ تاجور صاحب سے علیک سلیک ہوئی تو آپ نے لیکچر پلانا شروع کر دیا کہ میں ایسے غلیظ، فحش اور وہیات افسانے لکھتا ہوں۔ میں خاموش سنتا رہا، اس لیے کہ مولانا کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا۔

آغا شورش بڑے پر شور طریقے پر ملے۔ ابوسعید بزمی نے مجھ سے ایک سگریٹ لیا اور سلگا کر ٹھینے لگے۔ آواز پڑی تو حاضر عدالت ہوئے۔ کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے گواہ منجانب عدالت شمس العلماء مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی، پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور تھے۔ آپ نے فرمایا ”ٹھنڈا گوشت“ کسی مسجد میں یا کسی مجلس میں جماعتی حیثیت میں سننا پسند نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی پڑھے تو اپنا سر سلامت لے کر نہ جاسکے۔ چالیس سالہ ادبی زندگی میں ایسا ذلیل اور گندہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔

میں نے مولانا سے چند سوال کئے تو آپ نے جواباً کہا۔ ”یہ افسانہ میں نے پہلی بار دیال سنگھ کالج میں پڑھا لیکن پورا نہیں پڑھا۔ تھوڑا سا پڑھا اور لغو سمجھ کر بند کر دیا۔ مثنوی گلزار نسیم میں بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کا تذکرہ اخلاق سے متصادم ہے۔ فسانہ عجائب، مثنوی بہار

عشق، مثنوی فریب عشق اور الف لیلہ میں جو فحش حصے ہیں، وہ فحش ہیں۔ حکایت خانم و کنیز کا ذکر مثنوی مولانا روم میں لایا جاتا ہے لیکن میں نے نہیں پڑھا۔ جنسی ترغیب کا پہلو مثنوی مولانا روم میں نہیں ہو سکتا۔“

جی چاہتا تھا کہ مولانا کو خوب سناؤں مگر میں نے مناسب خیال نہ کیا اور چند سوال اور کر کے ان کو چھوڑ دیا۔ اب آغا شورش کا شمیری ولد آغا نظام الدین ایڈیٹر ہفتہ وار ”چٹان“ موچھوں کے اندر مسکراہٹیں بکھیرتے تشریف لائے۔ میری طرف دیکھ کر آپ کھل کر مسکرائے اور بیان دینا شروع کر دیا۔

آپ نے فرمایا۔ ”جہاں تک میرے علم اور احساسات کا تعلق ہے، میں نے ”ٹھنڈا گوشت“ سے اچھے تاثرات فراہم نہیں کئے۔ جس سماج اور گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اس کے پیش نظر میں ایسا مضمون اپنے پرچے میں شائع نہیں کروں گا۔ میرا مدرسہ فکر سے گوارا نہیں کرتا۔“

استغاثے کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آغا صاحب نے کہا۔ ”اس سے اوہاش قار کو ترغیب ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو جن کا رجحان طبیعت خاص طور پر بدکاری کی طرف مائل ہو۔“

ہماری طرف سے آغا صاحب پر کوئی جرح نہ کی۔ ابوسعید بزمی ایڈیٹر احسان لاہور پیش ہوئے تو آپ نے افسانے کو مخرب اخلاق قرار دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”افسانہ معنی و مطلب کی وجہ سے قابل اعتراض ہے۔“

میں نے بزمی سے پوچھا۔ ”کیوں حضرت؟ یہ بتائیے کیا اسی عدالت میں آپ کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چل رہا ہے۔“ آپ نے جب ”جی ہاں“ کہا تو مجسٹریٹ نے حیرت سے پوچھا۔ ”میری عدالت میں؟“

بزمی صاحب نے پھر جواب دیا۔ ”جی ہاں“

مجسٹریٹ صاحب نے قلم سے سر کھجا کر پائپ سلگا یا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

آخری گواہ منجانب عدالت یعنی ڈاکٹر تاثیر صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور آپ نے اپنے بیان میں کہا۔ ”کہانی ادبی لحاظ سے ناقص ہے، لیکن ہے ادبی۔ نشان لگائے ہوئے الفاظ کچھ اس کہانی کے لیے ضروری ہیں کچھ غیر ضروری ہیں۔ کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کو ناشائستہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں فحش اس لیے نہیں کہتا کہ لفظ فحش کی تعریف کے متعلق واضح نہیں ہوں۔ میرے خیال میں جن لوگوں کا میلان بدکاری کی طرف ہے، ان کے لیے اس مضمون میں جنسی ترغیب موجود ہے۔ جس شخص کی طبع میں میلان بدکاری نہ ہو اسے اس مضمون سے جنسی کراہت ہوگی، جنسی ترغیب نہیں ہوگی۔ ٹھنڈا گوشت کا مطلب مردہ لڑکی ہے۔ میں اس کہانی کو ایک عام جنسی کہانی سمجھتا ہوں۔ یہ جنسی اخلاق خراب نہیں کرتی۔“

میں ہندوستانیوں کا پرانا کیریئر بود ہو رہا ہے۔ ماتحت عدالت کے فاضل جج نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں جن کے لیے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور نصیحت کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالت فاضل کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں۔ ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ حسین چیز ایک دائمی مسرت ہے۔ آرٹ جہاں بھی ملے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں، سوسائٹی کے لیے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے چاہے اس کا موضوع غیر مستوری کیوں نہ ہو۔ یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے، سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مضمون ایسا نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے، اس لیے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ جرمانہ اگرا دیا گیا ہے تو واپس کیا جائے۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔“

اس فیصلے سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آرٹ فحش نہیں ہو سکتا ہے اور کسی فن پارے پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی نہیں کی جانی چاہیے۔

کوئی لٹریچر نہیں یعنی ادب پارہ معیاری یا غیر معیاری ہو سکتا ہے، اس لیے کہ آرٹسٹ ہو سکتا ہے اپنا معیار قائم نہ رکھ سکے۔ افسانہ نگار کا ہر افسانہ اس کا شاہکار نہیں ہو سکتا۔

”ٹھنڈا گوشت“ کے اسٹینڈرڈ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ افسانہ میرے دوسرے افسانوں کے پائے کا نہیں۔ یہ کام ادبی نقادوں کا ہے اور انہیں اس بات کا حق ہے کہ وہ جانچیں، پرکھیں۔ مگر اس افسانے پر کسی صورت میں بھی فحاشی کا الزام نہیں لگایا جاسکتا، اس لیے کہ مصنف کی طرف سے افسانوی ادب میں اچھا برا جیسا بھی ہے۔ یہ ایک اضافہ ہے لیکن اس صورت میں کہ مجھے اپنی پوزیشن صاف کرنا ہے۔ آئیے اس افسانے کو اچھی طرح جانچیں کہ اس میں فحاشی کا کوئی پہلو نکلتا ہے یا نہیں۔

افسانہ ٹھنڈا گوشت جیسا کہ ظاہر ہے، ایک افسانہ ہے جس کا عقبی منظر یوں تو گزشتہ فسادات ہیں لیکن دراصل جس کی بنیاد انسانی نفسیات پر قائم ہے اور انسانی نفسیات کا جنس سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

افسانے میں دو کردار ہیں۔ ایشرنگھ اور اس کی داشتہ یا بیوی کلونت کور کا۔ دونوں ٹھینٹ قسم کے گنوار سکھ ہیں۔ دونوں جنسی لحاظ سے بہت نکڑے ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ ایشرنگھ کو جنسی تشفی صرف کلونت کور ایسی عورت ہی سے اور کلونت کور کو جنسی تشفی صرف ایشرنگھ ایسے مضبوط اور توانا مرد ہی سے مل سکتی تھی۔ دونوں کی جنسی زندگی بڑی ہموار تھی۔ لیکن ایک ایسا وقت آتا ہے کہ جب کلونت کور محسوس کرتی ہے کہ ایشرنگھ تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کی جنسی محبت میں پہلی سی توانائی نہیں رہی۔ وہ اس سے بے رنجی برت رہا ہے۔ کسی اور عورت سے اس نے ناتا جوڑ لیا ہے۔ اصل

بات یہ تھی کہ سردار ایشرسنگھ ایک زبردست نفسیاتی رد عمل کا شکار تھا جس کے باعث اس کی جنسی توانائی قریب قریب مفلوج ہو چکی تھی۔

وہ لوٹ مار کے دوران میں قتل و غارت کرنے کے بعد ایک نوجوان مسلم دوشیزہ کو اٹھالایا تھا کہ وہ تبدیلی کے طور پر اس سے جنسی حظ اٹھائے۔ مگر جب اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ لڑکی دہشت کے مارے اس کے کندھوں پر ہی مر چکی تھی اور اس کے سامنے ایک ٹھنڈی لاش پڑی تھی۔ اس کی تپتی ہوئی شہوانی خواہشات کے ٹھنڈے گوشت کا لوتھڑا۔ اس کا ایشرسنگھ کو کچھ ایسا زبردست احساس ہوا کہ نفسیاتی طور پر نامرد ہو گیا۔

اگر ایشرسنگھ کو ٹھنڈی عورتوں سے سابقہ پڑا ہوتا، اگر ایشرسنگھ خود ٹھنڈا مرد ہوتا تو اتنا زبردست رد عمل نہ ہوتا، مگر جیسا کہ اس کا کردار پینٹ کیا گیا ہے وہ جنسی لحاظ سے بہت ہی توانا تھا اور اس کا جنسی رشتہ ایک ایسی عورت سے تھا جو ہر لحاظ سے اس کی ہم پلہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر بیان کئے گئے حادثے نے اسے جنسی لحاظ سے بالکل نکما کر دیا۔

یہ بات یہاں قابل غور ہے کہ قتل و غارت نے اور لوٹ مار نے ایشرسنگھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اس نے کئی افسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، مگر اس کے ضمیر پر احساس کی ایک ہلکی سی خراش بھی نہ آئی تھی۔ لیکن جب وہ لڑکی کی ٹھنڈی لاش پر جھکا تو اس کی مردانگی غائب ہو گئی۔

افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ کے بطن میں جو کچھ بھی ہو، ظاہر ہے کہ نقش نہیں۔ عنوان ہی ایک بین ثبوت ہے کہ افسانہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں شہوت کی گرم لہریں نہیں دوڑائے گا۔ جو حادثہ ایشرسنگھ کو پیش آیا وہ کیسے کسی قاری کو شہوانی جذبات کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ ایشرسنگھ کا انداز گفتگو اس کا اپنا ہے۔ ہزاروں آدمی عام روزمرہ کی زندگی میں وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو مصنف نے اس کے منہ سے کہلوائے ہیں۔ اس کی حرکات غیر فطری نہیں۔ اسی طرح کلونت کور کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔

استغاثے کے فاضل وکیل نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ ایشرسنگھ کے مکالموں میں گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں یہاں گالی کی نفسیات پر بحث نہیں کروں گا مگر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ الفاظ جو استغاثے کے وکیل کے نزدیک گالی ہیں، اصل میں گالی نہیں ہیں۔ میں یہاں گالی کی ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب، مرزا شہاب الدین خاں صاحب کے نام ایک رقعے میں لکھتے ہیں۔

”یہ شعر جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولد الزمانے داخل کر دیئے ہیں۔ اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیئے ہیں۔“ (اردوئے معلیٰ، صفحہ ۲۱۷)

مرزا شہاب الدین کے نام ایک اور خط میں ارشاد ہوتا ہے۔

”میاں وہ قاضی مسخرہ تو چوتیا ہے۔“ (اردوئے معلیٰ، صفحہ ۲۱۸)

□

گالی کے یہ نمونے تو ہو گئے لیکن اگر کوئی شخص گفتگو کے دوران میں یہ کہے ”میں بھی عجیب چوتیا ہوں کہ آپ یہاں اور میں آپ کو لاہور ڈھونڈتا پھرا۔“ تو ظاہر ہے لفظ چوتیا گالی نہیں۔ ”سالا“ ہمارے یہاں بہت بڑی گالی متصور کی جاتی ہے۔ لیکن بمبئی میں لفظ ”سالا“ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ عام گفتگو میں آپ کو وہاں کئی فقرے سننے میں آئیں گے۔

”ہمارا باپ سالا بڑا اچھا آدمی تھا۔“

”سالا ہم سے مشکیک ہو گیا۔“

”سالا کیسی بات کرتا ہے؟“

ماں بہن کی گالی یوپی اور پنجاب میں گفتگو میں عام استعمال ہوتی ہے اور کسی کے کان کھڑے نہیں ہوتے۔ خاص گالی اکثر لوگوں کا تکیہ کلام بن جاتی ہے۔ ایشرنگھ بھی چند گالیوں کو تکیہ کلام کے طور پر ہی استعمال کرتا ہے۔ اس لیے استغاثے کے فاضل وکیل کے اس نکتے پر زور دینا بالکل بے کار ہے۔

اس کے علاوہ یہ اہم بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایشرنگھ جیسے اجڈ اور گنوار آدمی سے شائستہ کلامی کی توقع کیے کی جاسکتی ہے۔ اس کے منہ میں اگر مصنف نے مہذب اور شائستہ الفاظ ڈالے ہوتے تو افسانے میں حقیقت نگاری کا خاتمہ ہو جاتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ افسانہ ایک نہایت ہی بھونڈی شکل اختیار کر لیتا اور آرٹ کی سطح سے بہت ہی نیچے خرافات کے کھڈ میں جا گرتا۔

سوال ہے جو چیز جیسی ہے اسے من و عن کیوں نہ پیش کیا جائے۔ ناٹ کو اٹلس کیوں بنایا جائے۔ غلامت کے ڈھیر کو عود و عنبر کے انبار میں کیوں تبدیل کیا جائے۔ حقیقت سے انحراف کیا ہمیں بہتر انسان بننے میں مدد و معاون ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔ پھر ایشرنگھ کے کردار اور اس کی گفتار پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے۔

ایشرنگھ کندہ دہن سہی افسانے کا موضوع گھناؤنا سہی، لیکن کیا اس کو پڑھنے کے بعد ہمیں انسانیت کی وہ رفق دکھائی نہیں دیتی جو ایشرنگھ کے سیاہ قلب میں خود اس کا مکروہ فعل پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ ایک صحت مند چیز ہے کہ اس افسانے کا مصنف انسانوں اور انسانیت سے مایوس نہیں ہوا۔ اگر مصنف نے ایشرنگھ کے دل و دماغ پر نفسیاتی رد عمل پیدا نہ کیا ہوتا تو یقیناً ”ٹھنڈا گوشت“ ایک نہایت ہی مہمل چیز ہوتی۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ تحریر جو انسانوں کو بتاتی ہے کہ وہ انسان سے حیوان بن کر بھی انسانیت سے علیحدہ نہیں ہو سکتے، فحش اور شہوت ابھارنے والی سمجھی جا رہی ہے۔ اور یہ لطیفہ ہے کہ افسانے میں ایک انسان کو اس کی رہی سہی انسانیت ایک بہت بڑی سزا دیتی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ایشرنگھ کو اپنی چری ہوئی گردن کا بالکل احساس نہیں تھا۔ اس کو آخری سانس تک صرف ایک ہی بات ستاتی

رہی..... کہ وہ ایک ٹھنڈی لاش سے زنا کرنے والا تھا۔

□

فرانس میں مشہور ناول نگار فلا بیئر کی تصنیف ”مادام بوواری“ پر فحاشی کا الزام میں مقدمہ چلا تو وکیل صفائی موسیو سینار نے فاضلانہ بحث کے دوران کہا۔

”حضرات! یہ کتاب جو بقول استغاثہ شہوانی جذبات کو بھڑکاتی ہے، موسیو فلا بیئر کے وسیع مطالعے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس نے اپنی توجہ متین فطرت کی وساطت سے ایسے ہی متن اور ملول مضامین کی طرف منعطف کی ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں جس کے خلاف وکیل استغاثہ نے بیجان خیز تصویروں کی نقاشی کے الزام میں جگہ جگہ اپنی تقریر میں زہرا لگا ہے۔۔۔۔۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ فلا بیئر کی فطرت میں بے انتہا سنگینی، شدید سنجیدگی اور بے پناہ ملال بھرا پڑا ہے۔“

میں اپنے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں۔ اتفاق سے میرا پیشہ تصنیف و تالیف ہے۔ اپنی فطرت اور جو تعلیم و تربیت مجھے ملی ہے اس کی بدولت میں نے آج تک سستا اور سوقیانہ ادب پیش نہیں کیا۔ اردو کے جدید ادب سے جو ذرا سا بھی واسطہ رکھتے ہیں ان کو میرے ادبی مقام کا علم ہے۔

افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ میں فلا بیئر کی فطرت کی بے انتہا سنگینی اور شدید سنجیدگی شاید نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ بے پناہ ملال سے بھرا پڑا ہے۔ اور جب سوال ملال کا ہو تو شہوت کا سوال ہی کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔

اب افسانے کے اس پہلو کو بھی دیکھا جائے کہ مصنف کی نیت کیا ہے۔ رائے صاحب لالہ سنت رام کی عدالت میں اپنے افسانے ”دھواں“ کے سلسلے میں صفائی کا بیان دیتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

”تحریر و تقریر میں شعر و شاعری میں سنگساری و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ترغیب مٹو لنی چاہیے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے اگر اس کا ایک شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر و شعر و ہت قطعی طور پر فحش ہے۔“

ظاہر ہے کہ ایسی کوئی ترغیب زیر بحث افسانے میں نہیں۔ میں افسانے کا تجزیہ اوپر کر چکا ہوں جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مصنف کی نیت میں کوئی فرق نہیں تھا اور اس نے محض ایک نفسیاتی حقیقت کو اس کے صحیح روپ میں افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ پڑھ کر اگر کسی صاحب کے جذبات برا بیختے ہوں تو انہیں کسی ذہنی معالج سے رجوع کرنا چاہیے۔ افسانہ ”دھواں“ ہی کی صفائی کے سلسلے میں میں نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

”ایک مریض جسم، ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں اصل میں انہی کے لیے شاعر شعر کہتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔“

میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لیے ہیں۔ نارمل انسان کے لیے جو عورت کے سینے کو عورت کا حصہ ہی سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔ جو عورت اور مرد کے رشتے کو استحباب کی نظر سے نہیں دیکھتے۔“

افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ بھی دوسرے ادب پاروں کی طرح صحت مند دماغوں کے لیے ہے۔ ایسے دماغوں کے لیے نہیں ہے جو معصوم اور پاکیزہ چیزوں میں بھی شہوت کرید لیتے ہیں۔

اگر عورت لوہے کی مشین کی حرکت سے شہوانی لذت حاصل کر لیتی ہیں تو کیا اس لوہے کی مشین یا اس کی حرکت پر سغلی جذبات براہیختہ کرنے کا الزام دھرا جائے گا۔ دنیا میں تو ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے بھی شہوانی لذت حاصل کر لیتے ہیں مگر ایسے لوگوں کا علاج ہونا چاہیے۔

امریکہ میں مشہور مصنف جیمز جویس کی تصنیف ”پولی سیز“ کو فاشی سے بری کرتے ہوئے نچ وولز نے اپنے فیصلے میں لکھا۔ ایک خاص کتاب ایسے جذبات اور خیالات پیدا کر سکتی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ عدالت کی رائے کے ذریعے یہ دیکھ کر ہوگا کہ اوسط درجے کے جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ایسے آدمی پر جسے فرانسیسی ”معمولی قسم کی حیات رکھنے والا انسان“ کہتے ہیں اور جس کی حیثیت قانون تفتیش کی اس شاخ میں ایک فرضی عامل کی ہوتی ہے جیسے عدالت خفیہ کے مقدموں میں ”سمجھ بوجھ والے آدمی“ کی حیثیت ہوتی ہے۔ یار جسٹری کے قانون میں ایجاد کے مسئلے کے متعلق ”فن کے ماہر“ کی۔

قانون کا تعلق صرف اوسط درجے کے آدمی سے ہے۔ چنانچہ افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ کے متعلق کوئی فیصلہ مرتب کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے مطالعے سے ایک اوسط درجے کی جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔

مشہور امریکی ناول نگار رسکاٹن کیلڈول کی تصنیف ”گوڈ زلل ایکٹر“ کو فاشی کے الزام سے بری کرتے ہوئے عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا۔

”مصنف کا مقصد ایک سچی تصویر پینٹ کرنا تھا۔ ایسی تصویروں میں بعض ضروری تفصیلوں کا آجانا لابدی امر ہے۔ اور چونکہ ایسی تفصیلوں کا گہرا تعلق زندگی کے جنسی پہلو سے ہوتا ہے اس لیے انہیں بہیمانہ صاف گوئی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے عدالت یہ حکم صادر نہیں کر سکتی کہ ایسی تصویریں سرے سے بنائی ہی نہ جائیں۔۔۔۔۔۔ کرداروں کی زبان بلاشبہ بھدی اور گندی ہے۔ مگر عدالت مصنف سے ان پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کے منہ میں شائستہ زبان ڈال دینے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔“

افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ ایک سچی تصویر ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ بڑی ہی بہیمانہ صاف گوئی سے اس میں ایک نفسیاتی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اگر اس میں کہیں گندگی اور غلامت ہے تو اسے مصنف کے ساتھ نہیں بلکہ افسانے کے کرداروں کی ذہنی سطح کے

ساتھ منسوب کرنا چاہیے۔

2

کسی تحریر کے چند الفاظ اگر چٹنی سے اٹھا کر لوگوں کو دکھائے جائیں کہ فحش ہیں تو اس سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔ ان الفاظ کی جداگانہ اشاعت قابل گرفت ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے غالب، میر، اسٹوفین، چاسر، بوکشیو بلکہ کتاب مقدس تک کے بعض مقامات کو قابل تعزیر گردانا جاسکتا ہے۔ تاہم کسی تحریر کو سمجھنے کے لیے اسے مجموعی طور ہی سے دیکھنا پڑے گا۔

مجھے آخر میں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ استغاثے کی طرف سے میری تصنیف ”ٹھنڈا گوشت“ پر کوئی ادبی تنقید نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے دلی مسرت ہوتی۔ افسانے میں اگر کوئی فنی کمزوری رہ گئی تھی، بیان میں اگر کوئی سقم تھا، انشاء میں اگر کوئی خامی تھی تو مجھے اس کا علم جاتا اور میں کچھ حاصل کرتا۔ لیکن میں یہاں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں اور ایک نہایت ہی گھناؤنے الزام کا منہ دیکھ رہا ہوں کہ میں نے اپنی تصنیف کے ذریعے لوگوں کے شہوانی جذبات ابھارے ہیں۔ اس کے خلاف میرے دل سے احتجاج کے سوا اور کیا چیز نکل سکتی ہے۔

حیرت ہے کہ ”ٹھنڈا گوشت“ پڑھ کر قاری کا ذہن خوف و نفرت میں مفلوف ہونے کی بجائے شہوت سے ملوث کیسے ہو سکتا ہے۔

اور بھی حیرت ہے کہ ایئر سٹگھ کو جو ہولناک سزا ملی وہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں شہوانی جذبات کیسے بیدار کر سکتی ہے۔ سولہ جنوری آن پہنچی۔ شیخ سلیم بہت پریشان تھا۔ اس پریشانی کے باعث اس نے زیادہ پینا شروع کر دی۔ نصیر انور حسب معلوم بے پرواہ تھا۔ عزیز عارف عبدالمتین کا حلق پہلے سے زیادہ خشک ہو گیا تھا۔

سولہ جنوری کی صبح کو پانچ سو روپے جیب میں ڈال کر میں ضلع کچھری روانہ ہوا۔ شیخ سلیم پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ صبح سے پی رہا تھا۔ بوتل پتلون کی جیب میں تھی۔ خود بہت مضطرب تھا لیکن بار بار مجھے تسلی دیتا تھا۔ ”بھائی جان! فکر کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں یہ سن کر مسکرا دیتا۔

اتنے میں نصیر انور اور عارف عبدالمتین بھی آگئے۔ عارف نے مجھ سے بڑے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”منٹو صاحب! آپ کا کیا خیال ہے، کیا ہوگا؟“

میں نے جواب دیا۔ ”وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔“

مجسٹریٹ صاحب آچکے تھے، مگر فیصلہ سنانے کا آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ گیارہ بج گئے۔ بارہ بج گئے۔ پانی پی پی کر ہمارے پیٹ اچھر گئے مگر آواز نہ پڑی۔ اتنے میں میرے ایک مخبر نے مجھے بتایا کہ فیصلہ تیار ہے مگر میاں اے ایم سعید اس میں شاید کچھ ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ میاں صاحب غائب ہیں یعنی اپنے کمرے میں موجود نہیں اور یہ کہ انہوں نے صبح سے کسی مقدمے کو ہاتھ تک

21

نہیں لگایا۔ ایک صاحب نے یہ کہا کہ وہ بہت پریشان ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

تھوڑی دیر کے بعد خبر پکی خبر لایا۔ ایک طرف لے جا کر اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔ ”میں فیصلہ دیکھ آیا ہوں۔ جلدی جلدی میں دیکھا ہے، صرف چند آخری سطریں۔ آپ کو یقیناً سزا ہوگی اور جرمانہ بھی۔ آپ کے نام کے آگے یہ لکھا تھا۔

And sentence him toundergo-----

اس کے آگے جگہ خالی تھی۔ دوسرے ملزموں کو صرف جرمانہ ہوگا۔ میں جاتا ہوں اور ضامن کا بندوبست کرتا ہوں۔“

میں سوچنے لگا، سزا کتنی ہوگی، ایک ماہ کی، دو ماہ کی یا چند دنوں کی۔ میں نے کسی سے بات نہ کی، البتہ شیخ خورشید صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔ آپ نے فوراً ضمانت کے کاغذ تیار کر لیے اور مجھ سے کہا۔ ”گھبرائیے نہیں، منٹو صاحب! سزا زیادہ سے زیادہ دس بارہ یوم کی ہوگی۔“ لیکن پھر کچھ سوچ کر تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایسا نہ ہو وہ ضمانت لینے سے انکار کر دے۔“

یہ سن کر مجھے کچھ تشویش ہوئی کیوں کہ مجسٹریٹ صاحب کا رویہ شروع سے مختصمانہ رہا تھا۔ لیکن کچھ کہا بھی تو نہیں جاسکتا تھا۔ خاموش، دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے شیخ سلیم کو ساری بات بتا دی۔ میرے جی کا بوجھ تو کسی قدر ہلکا ہو گیا مگر شیخ بے چارہ اور زیادہ مضطرب ہو گیا، لیکن تسلی دینے کی خاطر مجھ سے کہا۔ ”کچھ فکر نہ کرو بھائی جان۔۔۔۔۔۔ میں ٹیکسی لے کر وہاں جیل میں پہنچوں گا۔ روپیہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں ایسے معاملے نیبڑنا جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ اس وقت ایک بڑا پیگ لگا لیجئے۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں شیخ صاحب۔۔۔۔۔۔ شام کو۔“

شیخ صاحب نے کہا۔ ”تو آپ مطمئن رہیں، میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔“

یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ ایک بچکا تھا۔ شیخ سلیم، نصیر انور اور میں نے گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کے سامنے گھاس کے میدان میں بیٹھ کر ”آلو چھولے“ کھائے اور اس خیال سے کہ کہیں آواز نہ پڑ جائے۔ جلدی لوٹ آئے اور فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔

نصیر انور اور عارف عبدالستین سے میں نے اشارتاً کئی بار کہہ دیا تھا کہ وہ جرمانے کا بندوبست کر لیں کہ عین وقت پر پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ شیخ سلیم پی پی کرا سکی میں سوچ رہا تھا کہ وہ جیل میں مجھ تک کیسے پہنچے گا اور میری آسائش کا بندوبست کن ذرائع سے کرے گا۔

عزیزی مشتاق احمد اپنے ایک دولت مند دوست شریف صاحب کو میری ضمانت دینے کے لیے پکڑ لائے تھے۔ یہ غریب بھی ہماری طرح کھڑے بورر ہے تھے۔ شیخ سلیم کو غصہ تھا کہ جب وہ موجود ہے تو کوئی اور ضمانت دینے کے لیے کیوں لایا گیا۔ میں نے ان سے کہا۔

”شیخ صاحب! اگر آپ کو ضمانت دینے ہی کا شوق ہے تو دوا ملزم اور موجود ہیں۔“ شیخ صاحب اس وقت اچھے موڈ میں تھے۔ میری یہ بات سن

عارف عبدالمتین کے والد صاحب نے ان کا جرمانہ ادا کر دیا۔ اب رہ گئے نصیر انور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ ”میرے پاس تو فی الحال کچھ بھی نہیں۔“ مجسٹریٹ صاحب نے حکم دیا کہ ہتھکڑی لگاؤ اور جیل بھیج دو۔ نصیر انور اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔ میرے پاس دو سو روپے موجود تھے۔ چودھری نذیر مالک نیا ادارہ سے میں نے کا کہ ایک سو روپے کا بندوبست کر دیں مگر ان سے نہ ہو سکا۔ سپاہی ہتھکڑیاں لیے نصیر کی پیٹھ پیچھے کھڑا تھا ان کی جھنکار عدالت کے کمرے میں گونج رہی تھی باہر پولیس وین تھی۔۔۔۔۔ یعنی سارے لوازمات موجود تھے۔

آخر خورشید صاحب ہی کام آئے۔ آپ نے میاں اے ایم سعید صاحب سے بڑے مناسب و موزوں الفاظ میں درخواست کی کہ وہ نصیر انور کی ضمانت لے لیں۔ جرمانے کا روپیہ وہ کل صبح داخل کر دیں گے۔ مجسٹریٹ صاحب نے یہ درخواست قبول کر لی۔ اب ضامن کا سوال تھا۔ شیخ خورشید صاحب نے پوچھا۔ ”ان کی ضمانت کون دے گا؟“

کوئی آگے نہ بڑھا۔ اچانک شیخ سلیم نے جواب تک نشے میں دھت ہو چکے تھے شیخ خورشید صاحب سے مخمور لہجے میں کہا۔ ”نصیر صاحب کی ضمانت دیتا ہوں۔“ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اگر عدالت کو معلوم ہو گیا کہ شیخ صاحب پیسے ہوئے ہیں تو ان کی ضمانت کون دے گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور دھر لیے جائیں گے اور سارا معاملہ چوہٹ ہو جائے گا۔ میں اسی خوف کے مارے کمرے سے باہر چلا گیا۔ بار بار اندر جھانک کر دیکھتا کہ شیخ سلیم گرفتار ہوئے ہیں یا کہ نہیں، لیکن خیریت گزری۔ نصیر انور کی ضمانت ہو گئی۔ شیخ صاحب جھومتے ہوئے باہر نکلے اور مجھے گلے لگا کر رونے لگے۔ ”اللہ میاں نے میرے بھائی کو بچا لیا۔“ یہ کہہ کر آپ نے جیب سے بوتل نکال کر ایک گھونٹ بھرا جو آخری تھا۔ ”چلو بھئی چلیں، کہیں دکان بند نہ ہو جائے۔“

نصیر بہت ممنون و تشکر تھا۔ بار بار شیخ سلیم کا شکر یہ ادا کرتا تھا۔ شیخ صاحب نے اس سے کہا۔ ”شکر یہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ آپ میرے دوست کے دوست ہیں۔“

اب سیشن میں اپیل دائر کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ میاں اے ایم سعید کے فیصلے کی نقل حاصل کرنے کی درخواست دی۔ جب نہ ملی تو درخواست کے ساتھ ”نو“ پہنچے لگائے۔ نقل مل گئی۔

میاں صاحب کا فیصلہ انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اس کا اردو ترجمہ درج ہے۔

فیصلہ

ایک اردو رسالہ ”جاوید“ کے ایڈیٹر عارف عبدالمتین اور اس کے پبلشر نصیر انور کو مع ایک مصنف مسمی سعادت حسن منٹو کے میرے پاس مقدمہ زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی کے لئے بھیجا گیا۔ معزز الزکر کے خلاف الزام کے بعد ان کی فحش کہانی جس کا عنوان ”شہنشاہ گوشت“ مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے، کا مصنف ہے اور جو مذکورہ بالا رسالے کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ دوسرے دو ملزموں کے خلاف انہوں نے اس کہانی کو مندرجہ بالا انداز میں شائع کرنے کا جرم کیا ہے۔

رسالہ ”جاوید“ کا خاص نمبر مارچ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ سید ضیاء الدین مترجم پریس برانچ حکومت پنجاب کے علم میں آیا جو اس مقدمے میں گواہ استغاثہ نمبر ۳ کی حیثیت سے پیش ہوا ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی بھی طبع شدہ چیز میں کوئی فحش مواد محسوس کرے تو اس سے حکومت پنجاب کو مطلع کرے۔ اس کے خیال میں مذکورہ بالا ایڈیشن میں شائع شدہ کہانی بعنوان ”ٹھنڈا گوشت“ فحش تھی۔ چنانچہ اس نے حکومت پنجاب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور اس غرض کے لیے قانونی کارروائی کرنے کے لیے کہا۔ اس کہانی کی تصنیف اور خاص نمبر میں اس کی اشاعت سے انکار نہیں کیا گیا اور نہ پہلے دونوں ملزم رسالے کے مدیر اور ناشر ہونے سے منکر ہیں۔ لہذا اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کہانی بعنوان ”ٹھنڈا گوشت“ فحش ہے یا نہیں۔

استغاثے نے مذکورہ رسالے کے خاص نمبر کو پیش کیا ہے جو ریکارڈ میں Ex.P.F. کی حیثیت سے درج کیا گیا ہے۔ کہانی جو اس قانونی چارہ جوئی کا موضوع ہے اس شمارے کے صفحہ ۸۸ سے ۹۳ تک چھپی ہے۔ میں نے نہایت غور سے اس کہانی کو پڑھا ہے جو موضوع کی تشکیل کرتی ہے اور دیکھا کہ اس میں گند اطرز بیان اور ناشائستہ گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کہانی میں کئی شہوت پرستانہ مقامات پیش کئے گئے ہیں اور جنسی اشارات کا اکثر ذکر کیا گیا ہے۔

یہ طے کرنے کے لیے کہ آیا کوئی تصنیف مثلاً زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں ضروری ہے کہ ایک معیار مقرر کیا جائے جس سے فحاشی کی تمیز کی جاسکے۔

۳ کیوبی (۱۸۶۸ء) میں ہملکن رپورٹ میں اسی موضوع کے ایک مشہور مقدمے میں لارڈ کوک برن جی جے نے صفحہ نمبر ۳۶۰ (یا صفحہ ۱۷۳) پر فحاشی کا یہ معیار مقرر کیا تھا۔ اس قسم کا الزام زدہ مواد جو ان لوگوں کو بد اخلاقی اور بد چلتی کی ترغیب دے جن کے اذہان اس قسم کے مخرب اخلاق اثرات قبول کر سکتے اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کا مواد پہنچ سکتا ہو، معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمام عدالت ہائے عالیہ ہمیشہ اس معیار کی تقلید کرتی رہی ہیں۔ اس معیار سے یہ ظاہر ہے کہ قانون میں مستعملہ عریانی اس ماحول سے متعلق ہے جس میں کہ یہ جانچی جانی ہے۔ وہ باتیں جو ایک پاکستانی کے اخلاق کے لیے ضرر رساں خیال کی جائیں، جہاں تک ایک فرانسسی کا تعلق ہے بالکل بے ضرر سمجھی جاسکتی ہیں۔ ہر سوسائٹی کے اپنے اخلاقی معیار ہوتے ہیں۔ اور وہ چیزیں جو ایک سوسائٹی کا اخلاقی قوام خیال کی جاتی ہیں، بعض اسالیب کا اثر مختلف سوسائٹیوں کے افراد پر مختلف ہوتا ہے، خواہ یہ اظہار مخالف معیاروں کے نزدیک غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے زیر بحث کہانی کے فحش یا غیر فحش ہونے کا فیصلہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیاروں کے پس منظر پر کرنا ہوگا اور اس اثر کے مطابق جو اس قسم کی

تحریر اس سوسائٹی میں رہنے والے لوگوں کے اذہان پر ڈالے گی۔

□

لارڈ کوک برن کا قائم کردہ معیار ایک مکمل اور جامع تعریف نہیں ہے۔ یہ جیسا کہ اس کا مفہوم ظاہر کرتا ہے، صرف ایک معیار ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی معیار ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ رجحان ہے (یہ الزام مواد میں موجود ہے) جو قارئین کے اخلاقی احساسات کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ یہ معیار بھی قارئین کے اخلاق پر منحصر ہے۔

استغاثہ نے ابتدا میں صرف پانچ گواہ پیش کیے اور اپنا کیس بند کر دیا۔

گواہ استغاثہ:

۱۔ مسٹر محمد یعقوب مہینگر کپور پرنٹنگ پریس

۲۔ شیخ محمد طفیل

۳۔

۴۔ مرزا محمد اسلم۔ گواہ استغاثہ نمبر ۵ خدا بخش نے امور کے متعلق شہادت دی۔ جن کا فحاشی کا سے کوئی تعلق نہیں۔ گواہ استغاثہ نمبر ۳

ضیاء الدین نے دوسرے امور بیان کرنے کے علاوہ اپنی رائے ظاہر کی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے۔ تاہم ریکارڈ میں کوئی اس قسم کا مواد نہیں جس سے ظاہر ہو کہ یہ گواہ ماہر ادب سمجھا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں قانون شہادت کی دفعہ ۴۵ کی رو سے اس کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔ اس لیے جہاں تک فحاشی کے مسئلے کا تعلق ہے، استغاثے کا کیس جیسا کہ ابتداً پیش کیا گیا، خود عدالت کی رائے اور الزام زدہ مواد کے مطالعے کے بعد اس کی ماہیت پر منحصر ہو گیا۔

ملزمین نے صفائی میں سات گواہ ادبی امور کے ماہرین کی حیثیت سے پیش کئے۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ زیر بحث تحریر فحش نہیں ہے۔ صفائی کے اختتام پر استغاثے نے درخواست کی کہ مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر کچھ اور ماہرین بطور عدالتی گواہ بلائے جائیں اور میں نے انصاف کی خاطر چار اور ماہروں کو بطور عدالتی گواہ بلوایا۔

پیشتر ماہرین نے خواہ وہ صفائی کی طرف سے پیش ہوئے یا عدالت کی طرف سے، کسی نہ کسی فریق کے حق میں رائے دی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، تعزیرات میں جو فحاشی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے، اس کی ٹیکنیکل اہمیت ہے جس کا تعین عدالت کو کرنا ہے۔ ماہرین کی شہادت اسی حد تک ضروری ہے۔ جہاں تک یہ ادب کے مروجہ معیاروں، اظہار کی سبب سے، سوچا نہ پن، اخلاقی یا غیر اخلاقی حیثیت اور اس رجحان کے متعلق جو کوئی تحریر قارئین کے اذہان پر اثر انداز ہو، روشنی ڈالتی ہے۔ ان امور سے یہ تعین کرنا عدالت کا کام ہے کہ کوئی چیز ”فحاشی“ کی شرائط کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

صفائی کے گواہ نمبر ۱ مسٹر عابد علی عابد، نمبر ۲ مسٹر احمد سعید، نمبر ۳ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، نمبر ۴ ڈاکٹر سعید اللہ، نمبر ۵ فیض احمد فیض، نمبر ۶ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، نمبر ۷ ڈاکٹر آئی لطیف سب صاحب علم ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق کیوں کہ آرٹ زندگی کا آئینہ دار ہے اس لیے فن کار کوئی ایسی چیز ایجاد جو زندگی کی سچی تصویر ہو حقیقت پسندانہ طور پر پیش کرنے کے سے اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کرتا۔ اس لیے وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ زندگی کا حقیقت پسندانہ اظہار فنش نہیں ہو سکتا۔ وہ زیر بحث کہانی کی غیر شائستہ زبان اور اس کے سوقیانہ محاوروں کو بھی قابل گرفت نہیں سمجھتے کیوں کہ یہ اس قسم کی گفتگو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو پیش کردہ کردار کی نوع کے لوگ بولتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے یہ کہا کہ زیر بحث کہانی میں قارئین کے اخلاق کو بگاڑنے کا کوئی میلان نہیں پایا جاتا۔ بعض نے اس نکتے پر خاموشی اختیار کی۔ عدالتی گواہ نمبر ۱ مولانا تاجور، نمبر ۲ آغا شورش کاشمیری، نمبر ۳ مولانا ابوسعید بزوی، نمبر ۴ ڈاکٹر تاثیر بھی اسی پائے کے علمی آدمی ہیں۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ زیر بحث کہانی ”برا ادب“ ہے اور غیر شائستگی سے پیش کی گئی ہے۔

صفائی کے گواہ نمبر ۷ ڈاکٹر آئی لطیف نے رائے ظاہر کی کہ اگر زیر بحث کہانی کسی میڈیکل جریدے میں شائع ہوتی تو یہ ایک سبق آموز کیس ہسٹری ہوتی۔ لیکن ایک مقبول عام رسالے میں جسے ہر شخص پڑھ سکتا ہے، ناموزوں معلوم ہوتی ہے۔ صفائی کے گواہ نمبر ۵ کرنل فیض احمد فیض کا خیال ہے کہ اگرچہ وہ اسے فنش نہیں کہہ سکتے تاہم یہ کہانی ادب کا کوئی اچھا نمونہ نہیں۔ اس میں بعض غیر شائستہ محاورے استعمال کئے گئے ہیں جن سے اجتناب کیا جاسکتا ہے۔

عدالتی گواہ نمبر ۱ مولانا تاجور نے اس کی سخت اور غیر مبہم الفاظ میں مذمت کی۔ اور کہا کہ انہوں نے اپنے چالیس سالہ ادبی تجربہ میں اس سے زیادہ کوئی چیز غیر شائستہ نہیں دیکھی۔ عدالتی گواہ نمبر ۴ ڈاکٹر تاثیر کی رائے ہے کہ اس میں ان لوگوں کا اخلاق بگاڑنے کا رجحان موجود ہے جو شہوانی حرص کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے حوالے سے بہت صحیح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غیر شائستگی اور شہوانیت کی لگام شیطان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ غیر شائستگی، شہوانیت، نفس پرستی اور سوقیانہ پن زندگی میں موجود ہے۔ اگر ادبی مذاق کے اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے جسے صفائی کے گواہوں نے بیان کیا ہے تو زندگی کے پہلوؤں کا حقیقت نگارانہ اظہار اچھا ادب ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ہمارے معاشرے کے اخلاقی معیار کی خلاف ورزی کرے گا۔ ملزم سعادت حسن منٹو کی لکھی ہوئی کہانی ایک سوقیانہ آدمی کے کردار کو پیش کرتی ہے جو اپنی معشوقہ سے جسے بہت شہوت پرست دکھایا گیا ہے، وحشیانہ اور سوقیانہ انداز سے جنسی فعل کا طالب ہوتا ہے۔ جنسی تضمین کے ساتھ غیر شائستہ گالیوں کا استعمال عام کیا گیا ہے۔ جنسی نوع کے افعال کے سلسلے میں نسوانی جسم کے بعض پوشیدہ اعضاء کا ذکر نہایت بدتہذیبی سے کیا گیا ہے۔ ساری کہانی ایک ناشائستہ جنسی معاملے پر مرکوز ہے۔ درحقیقت جنسی بدتہذیبی ہی اس کہانی کا بنیادی تصور

ہے۔

21

ادبی اور نفسیاتی ماہر کہانی کا ایک خاص انداز سے رد عمل قبول کر سکتے ہیں، تاہم میری رائے میں ایک الہز نابالغ پر اس قسم کی کہانی کا رد عمل اظہار بول چال اور خیالات میں غیر شائستگی کی حوصلہ افزائی کی صورت میں ہوگا۔

سعادت حسن منٹو جیسے بزرگ خود مشہور مصنف کی مثال پیش نظر رکھتے ہوئے وہ نوجوان جو اس کہانی کو پڑھیں گے، اسی طرح اسے غیر شائستگی کو تقویت دیں گے۔

کہانی بعنوان ”ٹھنڈا گوشت“ کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ اس میں قارئین کا اخلاق بگاڑنے کا میلان موجود ہے اور یہ ہمارے ملک کے مروجہ اخلاقی معیاروں کی خلاف ورزی کرتی ہے۔

اس لیے میں ملزم سعادت حسن منٹو کو ایک فحش تحریر پیش کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہوں اور اسے زیر دفعہ ۲۹۲، پی پی سی تین ماہ قید با مشقت اور تین سو روپیہ جرمانے کی سزا دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اس کو مزید ۲۱ یوم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

ملزمین عارف عبدالمین اور نصیر انور جو واضح طور پر جریدے کے مدیر اور ناشر ہیں، جس میں مذکورہ کہانی شائع ہوئی ہے، ایک فحش تصنیف کی اشاعت عام کے مجرم ہیں اور وہ بھی اسی دفعہ کے تحت آتے ہیں۔ تاہم ان کے معاملے میں ان کی کم عمری کے پیش نظر اور پھر یہ کہ کہانی کا مصنف ایک ایسا شخص تھا جو خاصی ادبی شہرت کا مالک ہے اس اعتماد کی وجہ سے کہانی قبول کر لی ہوگی کہ یہ قابل قبول ادب پارہ ہو گا، میں ان ہر دو ملزموں کے لیے تین تین سو روپیہ جرمانے کی نرم سزا تجویز کرتا ہوں۔ چونکہ یہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے گی اس لیے میں اس کے مطابق حکم دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں ملزمین عارف عبدالمین اور نصیر انور کو اکیس یوم قید با مشقت بھگتنی پڑے گی۔

دستخط..... اے ایم سعید، مجسٹریٹ درجہ اول لاہور

۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء کو سیشن کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی، تاریخ طے پر ہم مہر الحق صاحب سیشن جج لاہور کی عدالت میں پیش ہوئے۔ آپ نے اس بنا پر کہ وہ مجھے اور میرے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور ہم شہر (یعنی امرتسر کے) تھے مقدمہ مسٹر جوشوا ایڈیشنل جج کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ دوسری پیشی پر حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ مسٹر جوشوا نے کیس واپس مہر الحق صاحب کو بھیج دیا ہے، یہ عذر ظاہر کر کے کہ وہ اردو زبان اچھی طرح نہیں جانتے۔۔۔۔۔۔۔۔ مہر الحق صاحب نے سوچ بچار کے بعد مقدمہ عنایت اللہ خاں صاحب ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت کے سپرد کر دیا۔ ہم حاضر ہوئے تو عنایت اللہ خاں صاحب نے ہمارے وکیل سے فرمایا۔ ”یہ کیس چونکہ میرے لیے اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے، اس لیے میں اچھی طرح اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے وقت درکار ہے، میں آپ کو ایک مہینے بعد کی تاریخ دیتا

ہوں۔“

21

شیخ خورشید احمد نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ چنانچہ دلائل کے لیے دس جولائی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے باہر آ کر مجھ سے کہا۔ ”اچھا ہے۔ اس دوران میں بھی خوب تیاری کر لوں گا۔“ لیکن انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ہمارا کیس غلط آدمی کے پاس گیا ہے جو بڑا تنگ خیال ہے۔ داڑھی رکھتا ہے نماز روزے کا پابند ہے۔ میں نے کہا۔ ”ہٹائیے یہاں نہیں تو ہائیکورٹ میں دیکھا جائے گا۔“ شیخ خورشید صاحب نے اس دوران میں اپنی رہبری کے لیے مجھ سے کہا کہ اپنے افسانے ”ٹھنڈا گوشت“ پر ایک مختصر سا تبصرہ لکھ دوں۔ چنانچہ میں نے درج ذیل سطور لکھ کر ان کے حوالے کر دیں۔

”یوں تو کہانی بظاہر جنسی نفسیات کے ایک نقطے کے گرد گھومتی ہے لیکن درحقیقت اس میں انسان کے نام ایک نہایت ہی لطیف پیغام دیا گیا ہے کہ وہ ظلم و تشدد اور بربریت و حیوانیت کی آخری حدود تک پہنچ کر بھی اپنی انسانیت نہیں کھوتا۔ اگر ایشرنگھ اپنی انسانیت کھو چکا ہوتا تو مردہ عورت کا احساس اس پر اتنی شدت سے کبھی اثر نہ کرتا کہ وہ اپنی مردانگی ہی سے عاری ہو جاتا۔

اسے شدید قسم کے اثر کو نفسیاتی نگاہ سے مناسب و موزوں اور قریب از حقیقت دکھانے کے لیے ضروری تھا کہ ایشرنگھ کو جنسی لحاظ سے عام مردوں کے مقابلے میں زیادہ قوی بتایا جاتا۔ چنانچہ مصنف نے کہانی میں جگہ جگہ اپنے قلم کی جنبش سے بقدر کفایت ایسا کیا ہے۔ ایشرنگھ کے کردار کے جنسی پہلو کو اور زیادہ اجاگر کرنے اور اس طرح اسے اس کے دردناک انجام کو قاری کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے مصنف نے کلونت کو رکھ کر پیش کیا ہے جو ایشرنگھ ہی کی طرح عام عورتوں کے مقابلے میں جنسی لحاظ سے کہیں زیادہ قوی اور توانا ہے۔

اگر ایشرنگھ ایک عام مرد ہوتا، اسی طرح اگر کلونت کو ایک عام عورت ہوتی تو یقینی طور پر افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ کا انجام کچھ اور ہی ہوتا۔ عام مرد پر جس کا جنسی تعلق ایک عام عورت سے رہا ہو، ایک لڑکی کی ٹھنڈی لاش ہرگز ہرگز وہ نفسیاتی اثر نہیں رکھتی جو ایشرنگھ نے اپنے قوی اور توانا جنسی کردار کے باعث محسوس کیا۔ اور اس شدت سے محسوس کیا کہ وہ اس کے نیچے دب کر، بلکہ پس کر اپنی مردانگی کھو بیٹھا۔

شہوت ایک جذبہ آتشیں ہے۔ انسان میں اگر یہ جذبہ بیدار ہو تو اس کے جسم میں گرم رودور جاتی ہے۔ اس کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ اس کا دل و دماغ تپ جاتا ہے۔ زیر بحث افسانے کا عنوان ”ٹھنڈا گوشت“ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عنوان جو معنوی اعتبار ہی سے ٹھنڈا ہے، قاری کے دل و دماغ میں کسی قسم کی گرمی پیدا نہیں کر سکتا۔

اگر عورت جنسی لحاظ سے کمزور ہو تو ہم اسے ”ٹھنڈی عورت“ کہتے ہیں، یعنی ایسی عورت جو مرد میں جنسی خواہش پیدا نہیں کرتی۔ افسانہ ”ٹھنڈا گوشت“ میں کلائمیکس پیدا کرنے والی ایک لڑکی کی ٹھنڈی لاش ایشرنگھ جیسے پر جوش شہوانی مرد کی ساری مردانگی پر برف کی سل کی

طرح گرتی ہے اور اسے بخبت کر دیتی ہے۔ ہم بخوبی سوچ سکتے ہیں کہ ”ٹھنڈا گوشت“ پڑھنے والے قارئین پر جو بقیہ ایشرنگھ کی طرح پر جوش شہوانی انسان نہیں ہو سکتے اس کہانی کے انجام نے کس قسم کا اثر چھوڑا ہوگا۔ صفائی کے گواہ ڈاکٹر سعید اللہ ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی ڈی ایس سی نے اپنے تاثر کو مختصر مگر جامع الفاظ میں کیا خوب بیان کیا ہے۔

”افسانہ ٹھنڈا گوشت پڑھنے کے بعد میں خود ٹھنڈا گوشت بن گیا۔“

جہاں تک نارمل انسانوں کا تعلق ہے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ پڑھنے کے بعد ان کا ردعمل بعینہ ایسا ہی ہوگا۔ یہ جدا بات ہے کہ وہ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کی طرح اپنے محسوسات کو بطریق احسن بیان نہ کر سکیں۔ ابنارمل انسانوں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ ایسے لوگ موجود ہیں جو لاشوں سے بھی مباشرت کر سکتے ہیں۔

”ٹھنڈا گوشت“ میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کو کسی مقام پر بھی لذیذ انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔ اولاً اس لیے کہ ایسا انداز افسانے کے مقصد سے متصادم تھا۔ ثانیاً اس لیے کہ افسانے کا مصنف ”شہوت نگار“ نہیں ہے۔ ٹھنڈا گوشت کوئی جوڑ دا آسن نہیں پیش کرتا۔ امساک کا نسخہ نہیں بتاتا۔ کسی خفیہ تصویر کی جھلک نہیں دکھاتا۔ ٹھنڈا گوشت البتہ ایک دردناک تصویر ہے، ایک ایسے مرد کی جس میں انسانیت کی رمتق اس کے کردار کی تمام ہولناکیوں کے باوجود باقی تھی۔ اس رمتق نے گواہ سے انجام کار نامہ مرد بنا دیا اور وہ اپنی جنسی زینق کے حسد کے باعث نہایت ہی تکلیف دہ موت سے ہمکنار ہوا، لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ مرتے ہوئے اسے اپنی موت کا احساس بالکل نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس کے دل و دماغ پر صرف ایک چیز مسلط تھی۔۔۔۔۔۔ اس لڑکی کی لاش کا برف ناک ردعمل جس کے ساتھ وہ مباشرت کرنا چاہتا تھا۔

مرنے سے پہلے ایشرنگھ کو اپنی بہیمیت کا احساس بھی ہوا اور یہ احساس اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی ظلمت میں روشنی کی ایک کرن تھی۔ مصنف لکھتا ہے۔

لہو ایشرنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔۔۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔۔ بھینی یا چھ آدمیوں کا قتل کر چکا ہوں۔۔۔۔۔۔ اسی کرپان سے۔“

ایشرنگھ نے اپنی کرپان سے چھ آدمی قتل کئے تھے جو نفسیاتی حادثہ اسے پیش آیا، اس سے پہلے غالباً اس نے کبھی غور نہ کیا ہوگا کہ اس کے ہاتھوں چھ آدمیوں کا خون ہو چکا ہے۔ مگر اب وہ اپنے خون کا ذائقہ چکھتے ہوئے سوچتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ یہ سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ جس کرپان نے میرا گلا کاٹا ہے اس سے چھ آدمی کاٹ چکا ہوں۔ اور جب وہ ”چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں“ کے ساتھ ”بھینی یا“ استعمال کرتا ہے تو کیا ہمیں اس گالی میں اس کی روح کی دردناک چیخ سنائی نہیں دیتی۔۔۔۔۔۔ آپ سنئے!

”اور میں۔۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔ بھینی یا چھ آدمیوں کا قتل کر چکا ہوں۔۔۔۔۔ اسی کرپان سے“

یعنی ایشرنگھ تو درد اور تکلیف محسوس کر رہا ہے۔۔۔۔۔ لیکن جانتا ہے تو یہ کہ اس کرپان سے تو نے چھ آدمی مارے ہیں!

ایشرنگھ سے ہم اس کے خیالات و محسوسات کے خوش اسلوب کی توقع نہیں کر سکتے۔ وہ ایک گنوار آدمی ہے، لیکن اس نے اپنے خام

انداز میں سب کچھ بیان کر دیا۔ اور یہ خام انداز اپنی جگہ پر مناسب و موزوں ہے۔

ایشرنگھ کی قوت مردمی سلب ہو چکی تھی، لیکن وہ اپنے اندر ایک نئی کروٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں کلونت کور کے دل و دماغ

پر صرف ایک خیال مسلط تھا کہ اس عورت کا جس نے اس کے خیال کے مطابق اس کے شوہر ایشرنگھ کو موہ لیا تھا۔ وہ پوچھتی ہے۔ ”کون ہے

وہ حرامزادی؟“

مصنف لکھتا ہے۔

ایشرنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا۔ ”گالی نہ دے اس بھڑوی

کو“

ان چھ الفاظ میں کیا مصنف نے ایشرنگھ کے سارے جذبات جمع نہیں کر دیئے۔ وہ کلونت کور کو منع کرتا ہے کہ اس عورت کو گالی نہ دے

لیکن خود اسے ”بھڑوی“ کہتا ہے۔ دراصل اس گالی کا رخ اس کی اپنی ذات کی طرف ہے۔ وہ بظاہر تو رحم اس عورت پر رکھتا ہے، جس کو کلونت

کو حرامزادی کہتی ہے، لیکن درحقیقت اس کو رحم اپنی حالت پر آتا ہے۔

ذرا آگے چلئے تو سارا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

کلونت کور چلائی۔ ”میں پوچھتی ہوں، وہ کون ہے؟“

ایشرنگھ کے گلے میں آواز زندہ گئی۔ ”بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا۔

”انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔“

یہاں ہم ایشرنگھ کو ایک فلسفی، ایک خام فلسفی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اور اس خام فلسفی کے عقب میں ہمیں صرف ایک چیز نظر آتی

ہے۔۔۔۔۔ اس لڑکی کی ٹھنڈی لاش جس سے ایشرنگھ جیسا ”گرم مرد“ مباشرت کرنا چاہتا ہے، وہ مسکراتا ہے، صرف مسکرانے کے لیے

نہیں اس کی مسکراہٹ دراصل اس حیرت کا مظہر ہے۔ چونکہ وہ سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس لیے وہ مسکراتا ہے اور اپنے

مضطرب ذہن سے فرار حاصل کرنے کے لیے خود سے کہتا ہے۔ ”انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔“

یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے جو کسی انسان کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔ اس کو شہوانی جذبات کی برا بیخستگی سے کیوں کر منسوب کیا جاسکتا

ہے۔ کہانی، جس میں ایک قوی اور توانا مرد کی شہوت سرد ہو جاتی ہے۔ پڑھنے والوں کے سفلی جذبات کیسے مشتعل کر سکتا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹھنڈا گوشت میں چند الفاظ اور فقرے موجود ہیں، جن کو اگر افسانے کے جسم سے نوج کر علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو وہ ناشائستہ اور غیر مہذب معلوم ہوں گے مگر وہ افسانے کا لازمی جزو ہیں جن کے بغیر افسانہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ کسی لفظ کو یا کسی فقرے کو اس کے گرد کے ماحول کے ساتھ ہی دیکھنا پڑتا ہے۔

اگر آپ ”جگ ساپزل“ میں سے ایک ٹکڑے کو اٹھالیں اور کہیں ”یہ گدھے کی دم ہے“ تو ظاہر ہے کہ آپ اپنی رائے صحیح طور پر قائم نہیں کر رہے اس لیے کہ اس ٹکڑے کو اس کے صحیح مقام پر رکھ کر ”جگ ساپزل“ کو من حیث المجموع دیکھنا پڑے گا کیوں کہ وہ ٹکڑا دوسرے ٹکڑوں کے ساتھ جڑ کر کسی خوبصورت عورت کے گلے میں پڑی ہوئی لومڑی کھال کی شکل اختیار کر جائے۔

اس کی علاوہ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ جو ناشائستہ اور غیر مہذب الفاظ یا فقرے ہیں، وہ کس قسم کے انسان کے منہ سے نکلے ہیں۔ ایشر سنگھ ایک گنوار اور غیر مہذب انسان ہے۔ اس کے منہ سے ہم شائستہ اور مہذب گفتگو کی توقع نہیں کر سکتے۔ اب ہم گالیوں کی طرف آتے ہیں جو ایشر سنگھ کے مکالموں میں ہمیں نظر آتی ہیں۔

ہم اس حقیقت سے کبھی اغماض نہیں کر سکتے کہ اکثر مہذب اور غیر مہذب انسان (مرد اور عورتیں) اپنی روزمرہ کی گفتگو میں گالیاں استعمال کرتے ہیں۔ ایشر سنگھ اپنی گفتگو میں گالیاں بغیر کسی تکلیف کے استعمال کرتا ہے، اس لیے کہ اس کا مقصد گالی دینا نہیں۔ اکثر مقامات پر وہ گالی کو بطور تکیہ کلام کے استعمال کرتا ہے، ملاحظہ ہو۔

”اور میں۔۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔ بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں۔“
ظاہر ہے کہ گالی کا رخ نہ تو خود ایشر سنگھ کی طرف ہے نہ ان چھ آدمیوں کی طرف جنہیں وہ قتل کر چکا ہے۔

”گلا چرا ہوا ہے ماں یا میرا۔“

ظاہر ہے کہ ”گلے“ کی ماں نہیں ہے جس کو وہ گالی دے رہا ہے۔

”یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے۔“

اس کے متعلق ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ دماغ کی کوئی بیٹی نہیں ہے، جس کو وہ گالی دے رہا ہے۔

اسی طرح کلونت کو ایک جگہ کہتی ہے۔ ”یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے۔“

دو مقامات پر ایشر سنگھ کہتا ہے۔ ”انسان ماں یا بھی عجیب چیز ہے۔“۔۔۔۔۔ ”انسان کڑی یا بھی عجیب چیز ہے“ جیسا کہ صفائی کے گواہ مسٹر آئی لطیف نے کہا ہے، یہ گالیاں اپنی جگہ بہت نفسیاتی اہمیت رکھتی ہیں۔ افسانے کو غور سے پڑھنے کے بعد قاری سمجھ سکتا ہے کہ ان

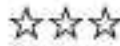
صاحب کر رہے تھے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ قانونی موٹو گائیڈوں نے بعد آپ نے مسکرا کر کہا۔ میں سعادت حسن منٹو کا اگر سزا دوں تو وہ یہ کہیں گے کہ ایک داڑھی والے نے مجھے سزا دی۔“ اس کے بعد وہ کچھ دیر اور عدالت ماتحت کے فیصلے پر کچھ کہتے رہے۔ آخر میں ہم سے مخاطب ہوئے۔ ”کیا آپ لوگوں نے جرمانہ ادا کر دیا تھا؟“

ہم سب نے کہا۔ ”جی ہاں“

اس پر جج صاحب نے کہا۔ ”آپ بری ہیں۔ جرمانہ آپ کو پورے کا پورا واپس مل جائے گا۔“

میں چند لمحات کچھ سوچ نہ سکا کہ کیا ہوا ہے۔ شیخ خورشید احمد صاحب نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا۔ ”اٹھئے حضرت! آپ بری ہیں۔“ عدالت سے باہر نکل کر جب میں نے چڑاسیوں کو دس روپے انعام کے طور پر دیئے تو مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی بری ہوں اور یہ کہ چوتھی مرتبہ انجام بخیر و خوبی ہوا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے ایک بہت بڑی لعنت سے مجھے رہائی دلائی۔ شیخ خورشید احمد صاحب اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے اور بجا خوش تھے۔

عنایت اللہ خان صاحب کے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے فیصلے کا اردو ترجمہ یہ ہے۔



اپیل بخلاف حکم مسز اے ایم سعید، مجسٹریٹ درج اول لاہور

مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء

دعویٰ زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی

عارف عبدالتین تین سو روپیہ جرمانہ؛ بصورت عدم ادائیگی تین ہفتہ قید با مشقت؛ سعادت حسن منٹو کو تین ماہ قید با مشقت اور تین سو روپیہ جرمانہ؛ بصورت عدم ادائیگی اکیس یوم قید با مشقت۔ نصیر انور تین سو روپیہ جرمانہ؛ بصورت عدم ادائیگی تین ہفتے قید با مشقت۔

فیصلہ

یہ تین نوجوان عارف عبدالتین، نصیر انور اور سعادت حسن منٹو کی طرف سے ایک اپیل ہے۔ اول اٹھ کر دونوں ایک اردو رسالہ ”جاوید“ کے علی الترتیب مدیر اور ناشر ہیں۔ تیسرا ایک ادیب ہے جس نے مذکورہ رسالے کے مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع شدہ ایک خاص نمبر میں اپنی ایک کہانی جس کا نام ”ٹھنڈا گوشت“ ہے، چھپنے کے لیے دی۔

انہیں بحکم میاں اے ایم سعید مجسٹریٹ درج اول لاہور مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی (فحش کتابوں کی فروخت وغیرہ) کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں مجسٹریٹ نے مقررہ سزا سنائی۔ سعادت حسن منٹو کو تین ماہ قید با مشقت اور تین سو روپیہ جرمانہ؛ بصورت عدم ادائیگی

جرمانہ ۲۱ یوم مزید قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔ دوسرے دو یعنی مدیر اور ناشر کو صرف تین تین سو روپیہ جرمانہ بصورت عدم ادائیگی تین تین ہفتہ قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔

یہ تینوں اپیل میں پیش ہوئے۔

واقعات فیصلہ زیر اپیل میں موجود۔

مضمون کی طرف حکومت کی توجہ پریس برانچ کے ایک عہدے دار نے مبذول کرائی تھی اور چیف سیکرٹری نے قانونی چارہ جوئی کا حکم دیا تھا۔

میں نے فریقین کے فاضل مشیران قانون کو سنا ہے اور مسل کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملزم کے خلاف جرم ثابت نہیں کیا جاسکا اور سزا برقرار نہیں رہ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ مضمون زیر بحث کو فحش اور خاص طور پر خلاف قانون قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ملزمین رسالہ سے اپنا تعلق مانتے ہیں۔ اب طے کرنے کے لیے فقط ایک سوال ہے کہ کہانی فحش اور خصوصاً خلاف قانون ہے یا کہ نہیں۔ اس سلسلے میں کئی نکلتے پیدا ہوتے ہیں۔ اولاً یہ کہ لفظ ”فحش“ سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ دوم یہ کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ماہرین کی شہادت پیش کی جاسکتی ہے۔ سوم یہ کہ آیا مضمون زیر بحث قابل اطلاق معیاروں کے مطابق فحش قرار دیا جاسکتا ہے۔ میں نے قانون جرائم ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں تن لال وغیرہ کی کومنٹری دیکھی ہے اور وہاں اٹھائے ہوئے سوالوں پر فریقین کے پیش کردہ دلائل پر غور کیا ہے۔

فحش کی جانچ پڑتال کا معیار وہاں یہ مقرر کیا گیا ہے۔ ”آیا فحش کے تحت الزام زدہ مضمون میں ان لوگوں کے اخلاق بگاڑنے اور ان کو بری ترغیب دینے کا میلان ہے جن کے ذہن ایسے غیر اخلاقی اثرات قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کی تصنیف عوام کے اخلاق کے لیے ضرر رساں ہے اور اندازہ کیا جائے کہ وہ جن کے ہاتھ میں پہنچے گی ان کے ذہن میں بدچلنی اور بدکاری کا اثر پیدا کرے گی تو یہ ایک فحش اشاعت ہوگی۔ قانون کا منشا ہے کہ اس کو روکے۔ اگر کوئی تحریر حقیقتاً کسی ایک بھی جنس کے نوجوانوں یا زیادہ عمر کے لوگوں کے اذہان کو انتہائی گندے اور شہوت پرستانہ قسم کے خیالات سمجھائے تو اس کی اشاعت خلاف قانون ہے، خواہ ملزم کے پیش نظر کوئی ور پر وہ مقصد ہی کیوں نہ ہو جو معصوم حتیٰ کہ قابل تعریف ہو۔ کوئی چیز جو شہوانی جذبات کو مشتعل کرے، فحش ہے۔“

پھر ایسے فیصلے بھی ہیں جو قرار دیتے ہیں کہ محض فقروں اور جملوں کو اس لیے معاف نہیں کیا جاتا کہ باقی کی اشاعت قابل اعتراض ہے اور یہ کہ یہ کوئی جواز نہیں کہ شائع شدہ مضمون کسی ممتاز مصنف کا لکھا ہوا ہے یا ایسے اسلوب میں لکھا گیا ہے جو آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا یہ کہ اشاعت میڈیکل ہے اور صرف مخصوص گاہکوں کے پاس پہنچی جاتی ہے۔ ہمیں نہ صرف تصنیف کی ماہیت کو بلکہ حاضرہ معاشرہ کی حالت کو بھی دیکھنا ہے۔ اگر تصنیف بازار میں آزادانہ مہیا ہو سکتی ہے تو ہمیں یہ طے نہیں کرنا کہ مخصوص یا خواہش سے خریدنے

والے لگائے اور پڑھنے والے کون ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ عوام تک پہنچ سکتی ہے؟ جن میں دونوں ضمنی کے جواں سال اور بڑی عمر کے لوگ بھی شامل ہیں۔

پس ہمیں تصنیف کی ماہیت کا اپنے سماج کی موجودہ حالت کی روشنی میں تعین کرنا ہے۔

میرے خیال میں اس معاملے کو اس مقام پر چھوڑا جاسکتا ہے اور ہمیں اس کی طرف بعد میں رجوع کرنا چاہیے۔ جب ہم اس مسئلے پر غور کر چکیں کہ آیا یہ سوال ماہروں کی رائے سے طے ہو سکتا ہے یا نہیں۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ معاملہ ماہروں کی رائے سے ہرگز طے پانے والا نہیں۔ ہمیں اس پر غور نہیں کرنا کہ اس کے متعلق کچھ خاص اور ممتاز ادیب کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمیں یہ پڑتالنا ہے کہ پڑھنے والوں پر عام طور سے تحریر و تصنیف کا کیا رد عمل ہوگا۔

اگر میرا یہ خیال درست ہے تو فاضل عدالت ماتحت کی ریکارڈ کردہ شہادتوں کا کوئی حصہ اس نکتے کے لحاظ سے قابل قبول نہیں رہ سکتا۔ اگر بفرض محال ہم ان حضرات جو فریقین یا عدالت کی طرف سے پیش ہوئے۔ ان کی شہادت کو عام پڑھنے والوں کی شہادت کی حیثیت سے قبول کریں اور کسی ایک فریق کو خاص اہمیت نہ دیں تو ریکارڈ شدہ شہادت عدالت کوئی زیادہ مدد نہیں دیتی۔ گواہوں کی ایک جماعت نے یہ کہا کہ زیر بحث مضمون انتہائی فحش ہے۔ دوسری جماعت نے اس کے خلاف بیان دیا ہے اور اسے ایک ایسا فن پارہ قرار دیا ہے جس میں کوئی بھی غیر اخلاقی چیز نہیں۔

غور کرنے پر یہ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ رائے عین قدرتی فرق ہے۔ مختلف طبقوں کے پڑھنے والوں کا رد عمل مختلف ہوتا ہے۔ جب تک ہم جانچ کا ایک معیار مقرر نہ کریں، جس کو پیش نظر رکھا جائے، اتفاق رائے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف مزاجوں، عمروں، پیشوں اور مختلف قسم کی تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں کا رد عمل بھی ضرور مختلف ہوگا اور علاوہ اس کے کہ یہ طے ہے کہ اخلاق ایک اضافی اصطلاح ہے۔ فحاشی کے سوال پر نظریات ضرور ایک دوسرے سے مختلف اور بہت نمایاں حد تک مختلف ہوں گے۔

میری رائے میں صحیح بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس ”افسانوی آدمی“ پبلک کے ایک عام رکن کے نقطہ نظر سے جانچنا چاہیے۔ یہ طے کر چکنے کے بعد ہمیں یہ دیکھنے کے لیے زیر بحث مضمون پر غور کرنا ہے کہ یہ ہمارے سماج کے مسلمہ اخلاقی نظریات کے خلاف کہاں تک جاتا ہے۔

اس موقع پر مجھے زیر اپیل فیصلے کے ایک غلط مفروضے اور گمراہ کرنے والی دلیل کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ فاضل مجسٹریٹ نے اس بیان سے ابتدا کی کہ ”فحاشی“ کی اصطلاح اس ماحول کے ساتھ متعلق ہے جس میں اس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ مختلف

قوموں اور سوسائٹیوں کے معیار مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک وہ درست تھا۔ اس نے غلطی وہاں کی جب اس نے سمجھا کہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے سوا اور کہیں سے زیادہ صحیح طریقے پر معلوم نہیں ہو سکتے پھر وہ یہ کہتا ہے کہ اس کے مطابق ”غیر شائستگی اور شہوت پرستی شیطان کی طرف سے ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ یہ ہمارا آدرشن ہے، لیکن سوال یہ نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ ہمارے سماج کی اصلی حالت کیا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ ہم نے اپنا نصب العین ابھی تک حاصل نہیں کیا۔ اپیل کرنے والوں کو اس کے مطابق جانچنا چاہیے جس طرح کہ ہماری سوسائٹی ہے نہ کہ اس طرح جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ کیسی کیسی مطبوعات مارکیٹ میں موجود ہیں جن پر کوئی احتساب قائم نہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیر بحث مضمون کہیں کم قابل اعتراض ہے۔ متعدد ”اسراری“ مطبوعات کی اشاعت کے خلاف کوئی پابندی نہیں جن سے زیادہ اور کوئی چیز فحش نہیں ہو سکتی۔ سینماؤں میں ”تماشاؤں“ کی نمائش پر کوئی احتساب نہیں جو زیر بحث مضمون سے کچھ کم قابل اعتراض نہیں ہوتے۔ اگر ہمیں مغربی تہذیب کو اپنانا اور اس کو پسند کرنا ہے جیسا کہ ہم کر رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایسی تحریر پر جیسی کہ ہمارے سامنے موجود ہے، معقول طور پر فحاشی کا اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ تو اس تہذیب کا لازمی نتیجہ ہے اور حسب معمول اس کے سوا کچھ نہیں۔

چوما چائی اور بغل گیری ایک ایسی چیز ہے جو ہر روز سینماؤں میں پیش کی جاتی ہے۔ بدکاری وہ عام اور بنیادی زمین ہے جس پر ”ہچی کہانیاں“ اور دائمی مثلثیں استوار کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہی تمام انگریزی اور مغربی ناولوں کا بنیادی پلاٹ ہے۔ اگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں ان نوجوانوں پر سختی کریں۔

زیر بحث کہانی رسالے کے صفحہ ۸۸ سے لے کر ۹۳ تک چھپی ہے۔ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک خاص شخص کا جس کا نام ایشر سنگھ تھا، ایک خاص عورت کلونت کور کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ اس نے فسادات کے دوران میں ایک مکان میں چھ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اور ایک خوبصورت لڑکی کو وہاں سے اٹھالیا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے پتہ چلا کہ لڑکی مرچکی ہے، ٹھنڈا گوشت ہے۔ اس کہانی کہے مطابق اس انکشاف نے ایشر سنگھ پر ایسا اثر ہوا کہ اس کے شہوانی جذبات کو اتنا سن کر دیا کہ جب وہ بعد میں کلونت کور کے پاس گیا تو وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس کے ساتھ سو سکے حالانکہ اس نے اس مقصد کے لیے ابتدائی اقدام اٹھائے تھے۔

اس میں یہاں وہاں کچھ ناشائستہ اصطلاحیں اور کچھ قابل اعتراض الفاظ موجود ہیں اور کچھ سوقیانہ گالیاں بھی۔۔۔۔۔۔ بالکل اسی قسم کی جو ہماری سوسائٹی کے نچلے طبقے میں عام ہیں۔

اب کسی مضمون کی ماہیت پر غور کرنے کے لیے آدمی کو اصطلاحات اور تصریحات کو زیر نظر رکھنا پڑے گا۔ مثلاً چند ایک کا نام لیں تو

ایک مضمون ”باذوق“ یا ”بد ذوق“ ----- ”غیر مناسب“ یا ”سوقیانہ“ یا ”ناشائستہ“ یا ”فحش“ ہو سکتا ہے۔ ایضاً تدریجی رنگوں کے امتزاج کو ایک دوسرے سے الگ ہٹا کر اس مضمون کے متعلق کہوں گا۔ وہ یہ ہے کہ سوقیانہ اور ناشائستہ ہے۔

فاضل پی پی ایس نے کسی ایسے خاص قابل اعتراض پیروں کی طرف اشارہ نہیں کیا جس کو وہ یقینی طور پر ”فحش“ قرار دیتا۔ کسی شخص نے کہانی کی چند سطروں پر نشان لگائے ہیں۔ لیکن وہ ایسی ہی ہیں جن کے متعلق میں پیشتر ذکر کر چکا ہوں اور ان کو دوبارہ پیش کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

مجھے اس لیے فاضل عدالت ماتحت سے اختلاف ہے لیکن میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ مجھے اس مضمون سے اتفاق ہے۔ میں اسے ”فحش“ یا زیادہ قابل اعتراض نہیں سمجھتا۔

چنانچہ میں اپیل منظور کرتا ہوں اور تینوں اپیلوں کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔ وہ پہلے ہی ضمانت پر ہیں۔ جرمانہ اگرا کر دیا گیا ہے تو وہ سارے کا سارا واپس دیا جائے۔

ایک لطیفہ سنئے۔ گیارہ جولائی کی صبح نذیر احمد چودھری مالک ”نیا ادارہ“ اور مدیر ”سویرا“ جو دوسرے ترقی پسند کے ساتھ مل کر مجھے رجعت پسند قرار دے چکے ہیں اور حلف اٹھا چکے ہیں کہ میری کوئی تحریر اپنے ”سویرا“ میں شائع نہیں کریں گے، تشریف لائے۔ بغل گیر ہو کر بڑی گرم جوشی سے مبارکباد دی اور کہا۔ ”منٹو صاحب! اب ”ٹھنڈا گوشت“ عنایت فرمادیجئے“ میں ”نمرود کی خدائی“ میں شامل کر لوں۔“

میں چودھری صاحب کی اس درخواست پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

چند دن ہوئے کوہاٹ سے ایک صاحب آفیسر کیڈٹ مظہر علی خان کا خط موصول ہوا۔

”مجھے امید ہے آپ کو یاد ہوگا کہ میں کون ہوں۔ ریاض صاحب کی دکان پر آپ سے چند ملاقاتوں ہی نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ بہت دن ہوئے میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کو ”ٹھنڈا گوشت“ سے نجات مل گئی ہے۔ فرصت کم ہونے کے باعث آپ کو مبارکباد کا خط نہ لکھ سکا۔ اب گو مبارکباد بہت دیر سے ہے لیکن پھر بھی آپ قبول فرمائیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ ایسی مخالفتوں کے باوجود آپ کے مداح بڑھتے ہی جائیں گے۔“

سنا ہے چودھری محمد حسین جو آپ کے ساتھ اکثر نوک جھونک کرتے رہتے تھے، اس دنیا ہی سے چل بے۔ اب تو معاملہ کچھ بے مزا سا ہو گیا۔ لیکن دنیا میں سر پھروں کی کمی نہیں، کوئی اور صاحب ان کی جگہ ضرور سنبھال لیں گے۔“

مجھے چودھری محمد حسین صاحب کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ اب کہ وہ اس دنیا میں نہیں، میں ان کے

□

متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ ان کی جگہ اگر کوئی دوسرا سنبھال لے گا تو میں کہوں گا۔۔۔۔۔۔
سر دوستاں سلامت کہ تو خیر آزمائی



سعادت حسن منٹو

لاہور ۲۹ اگست ۱۹۵۰ء

21

ٹھنڈا گوشت

ایشرسنگھ جونہی ہونٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور پٹنگ پر سے اٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی پختی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پر اسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پٹنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشرسنگھ جو غالباً اپنے پرانگندہ خیالات کے الجھے ہوئے دھاگے کھول رہا تھا، ہاتھ میں کرپان لیے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی سے گزر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا اور دونوں ٹانگیں پٹنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشرسنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کو لہے، تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور کچھ زیادہ ہی اوپر کو اٹھا ہوا سینہ تیز آنکھیں بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمی غبار، تھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشرسنگھ گوسر مہوڑائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا، سر پر اس کے کس کر باندمی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہوئی تھی، اس کے ہاتھ جو کرپان تھا مے ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے، مگر اس کے قد و قامت اور خدو خال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کلونت کور جیسی عورت کے لیے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی سے گزر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی۔ لیکن تیز تیز آنکھوں کو نیچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔ ”ایشرسیاں!“

ایشرسنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کی طرف دیکھا، مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ کلونت کور چلائی۔ ”ایشرسیاں!“ لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پٹنگ پر سے اٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی۔ ”کہاں رہے تم اتنے دن؟“

ایشرسنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”مجھے معلوم نہیں۔“

کلونت کور بھنا گئی۔ ”یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے۔“

ایشرسنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پٹنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پٹنگ کی

طرف دیکھا جو اب ایشرنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ”جانی! کیا ہوا تمہیں؟“

ایشرنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹولنا شروع کیا۔ ”کلونت!“
آواز میں درد تھا۔ کلونت کور ساری کی ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آگئی۔ ”ہاں جانی!“ کہہ وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔
ایشرنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کو سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا اس کے گوشت بھرے کوہے پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا۔ ”یہ کڑی یاد ماغ ہی خراب ہے۔“

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ”ایشرسیاں کہاں رہے تم اتنے دن؟“
”برے کی ماں کے گھر“ ایشرنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا۔
”قسم واگورو کی بڑی جاندار عورت ہو۔“

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشرنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیئے اور پوچھا۔ ”تمہیں میری قسم بتاؤ کہاں رہے
----- شہر گئے تھے؟“

ایشرنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا۔ ”نہیں“
کلونت کور چڑگئی۔ ”نہیں“ تم ضرور شہر گئے تھے۔ اور تم نے بہت سا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔“
”وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔“

کلونت کور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا اس رات تمہیں ہوا کیا۔ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے مجھے تم نے وہ تمام کہنے پہنار کھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کر لائے تھے۔ میری ہتھیالیاں لے رہے تھے پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا اٹھے کپڑے پہن کر باہر نکل گئے۔“

ایشرنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا۔ ”دیکھا کیسے رنگ نیلا پڑ گیا۔ ایشرسیاں، قسم واگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔“

”تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں۔“

ایشرنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے

□

کہا۔ ”ایشریاں! کیا بات ہے تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟“

ایشرسنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کور کو اپنے تو منہ باز ووں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ

بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ ”جانی میں وہی ہوں۔۔۔۔۔ گھٹ گھٹ پاتھپیاں تیری نکلے ہڈاں دی گرمی۔۔۔۔۔“

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی۔ ”تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟“

”برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔“

”بتاؤ گے نہیں؟“

”کوئی بات ہو تو بتاؤں۔“

”مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولوں۔“

ایشرسنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیئے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیئے۔ مونچوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آگئی۔ دونوں ہنسنے لگے۔

ایشرسنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوانی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”آ جاؤ ایک بازی تاش کی ہو جائے۔“

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور

کہا۔ ”چل! دفان ہو۔“

ایشرسنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولہے پر زور سے چنگلی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ”نہ کر ایشریاں، میرے درد

ہوتا ہے۔“

ایشرسنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشرسنگھ نے اپنا

کرتہ اتار کر پھینک دیا اور کہا۔ ”لو پھر ہو جائے ترپ چال۔۔۔۔۔“

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا۔ ایشرسنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیض کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال

اتارتے ہیں اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے بازو پر چنگلی لیتے ہوئے

کہا۔ ”کلونت! قسم واگوروی! بڑا ہی کراری عورت ہے تو۔“

کلونت کور اپنے بازو پر ابھرتے ہوئے لال دھبے دیکھنے لگی۔ ”بڑا عالم ہے تو ایشریاں!“

ایشرسنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا۔ ”ہونے دے آج ظالم!“ اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ کلونت کور

آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

21

خون ایشرنگھ کے گلے سے اڑا کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکرے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا۔ ”میری جان! تم نے بہت جلدی کی۔ لیکن جو ہوا ٹھیک ہے۔“

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا۔ ”مگر وہ کون ہے؟ تمہاری ماں!“

لہو ایشرنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

”اور میں۔۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔ بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں۔۔۔۔۔ اس کرپان سے۔“

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی۔ ”میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟“

ایشرنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا۔ ”گالی نہ دے اس بھڑوی کو۔“

کلونت چلائی۔ ”میں پوچھتی ہوں، وہ کون ہے؟“

ایشرنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی۔ ”بتاتا ہوں“ یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اسپر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا۔

”انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔“

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی۔ ”ایشرسیاں! تو مطلب کی بات کر۔“

ایشرنگھ کی مسکراہٹ اس کی لہو بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی۔ ”مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں۔ گلا چرا ہے ماں یا میرا

۔۔۔۔۔ اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا۔“

اور جب وہ بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے سپینے کے لپ ہونے لگے۔ ”کلونت! میری جان! میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے

ساتھ کیا ہوا۔ انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔۔۔۔۔ شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ گہنے پاتے

اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ میں نے تمہیں دے دیئے۔ لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی۔“

ایشرنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا۔ ”کون سی

بات؟“

ایشرنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا۔ ”جس مکان پر میں نے دھاوا بولا تھا

۔۔۔۔۔ اس میں سات۔۔۔۔۔ اس میں سات آدمی تھے۔۔۔۔۔ چھ میں نے قتل کر دیئے۔۔۔۔۔ اسی کرپان سے

جس سے تو نے مجھے ----- چھوڑا سے ----- سن ----- ایک لڑکی تھی بہت سندر ----- اس کو اٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا۔“

کلونت کور خاموش سنتی رہی۔ ایشرنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہواڑا یا۔

”کلونت جانی! میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی ----- میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا، نہیں ایشرسیاں، کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ۔“

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا۔ ”ہوں -----!“

اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا۔ راستے میں ----- کیا کہہ رہا تھا میں ----- ہاں راستے میں ----- نہر کی پٹری کے پاس تھوہڑکی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا۔ پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں ----- یہ کہتے کہتے ایشرنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نکل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

ایشرنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔ ”میں نے ----- پتا پھینکا ----- لیکن ----- لیکن -----“ اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

ایشرنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔

”وہ ----- وہ مری ہوئی تھی ----- لاش تھی ----- بالکل ٹھنڈا گوشت ----- جانی مجھے اپنا ہاتھ دے۔“

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشرنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔



21

گولی

شفقت دوپہر کو دفتر سے آیا تو گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ عورتیں تھیں، جو بڑے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ شفقت کی بیوی عائشہ ان کی مہمان نوازی میں مصروف تھی۔ جب شفقت صحن میں داخل ہوا تو اس کی بیوی باہر نکلی اور کہنے لگی۔ ”عزیز صاحب کی بیوی اور ان کی لڑکیاں آئی ہیں۔“

شفقت نے ہیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ”کون عزیز صاحب؟“

عائشہ نے آواز دبا کر کہا۔ ”ہائے آپ کے اباجی کے دوست!“

”اوہ۔۔۔۔۔ عزیز چچا“

”ہاں ہاں وہی۔“

شفقت نے ذرا حیرت سے کہا۔ ”مگر وہ تو افریقہ میں تھے۔“

عائشہ نے منہ پر انگلی رکھی۔ ”ذرا آہستہ بات کیجئے۔ آپ تو چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ افریقہ ہی میں تھے لیکن جو افریقہ میں ہو، کیا

واپس نہیں آسکتا۔“

”لو اب تم لگیں مین میخ کرنے۔“

”آپ تو لڑنے لگے۔“ عائشہ نے ایک نظر اندر کمرے میں ڈالی۔ ”عزیز صاحب افریقہ ہی میں ہیں، لیکن ان کی بیوی اپنی لڑکی کی

شادی کرنے آئی ہیں۔ کوئی اچھا بڑا ہونڈ رہی ہیں۔“

اندر سے عزیز کی بیوی کی آواز آئی۔ ”عائشہ تم نے روک کیوں لیا شفقت کو؟ آنے دو۔۔۔۔۔ آؤ، شفقت پیٹا، آؤ۔ تمہیں دیکھے

اتنی مدت ہوئی ہے۔“

”آیا، چچی جان!“ شفقت نے ہیٹ اسٹینڈ کی کھونٹی پر رکھا اور کمرے میں داخل ہوا۔ ”آداب عرض، چچی جان!“

عزیز کی بیوی نے اٹھ کر اس کو دعائیں دیں۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھ گئی۔ شفقت بیٹھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ سامنے صوفے پر دو گوری

گوری لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ ایک چھوٹی تھی، دوسری بڑی۔ دونوں کی شکل آپس میں ملتی تھی۔ عزیز صاحب بڑے وجہہ آدمی تھے۔ ان کی وہ

وجاہت ان لڑکیوں میں بڑے دلکش طور پر تقسیم ہوئی تھی۔ آنکھیں ماں کی تھیں، نیلی بال بھورے اور کافی لمبے۔ دونوں کے دو دو چوٹیاں تھیں۔ چھوٹی کا چہرہ بڑی کے مقابلے میں زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ بڑی کا چہرہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

ان کی ماں ان سے مخاطب ہوئی۔ ”بیٹا سلام کرو بھائی کو۔“

چوٹی نے اٹھ کر شفقت کو آداب عرض کیا۔ بڑی نے بیٹھے بیٹھے ذرا جھک کر کہا۔ ”تسلیمات!“

شفقت نے مناسب و موزوں جواب دیا۔ اس کے بعد عزیز صاحب اور افریقہ کے متعلق باتوں کا لاتنا ہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیروبی، ناگانیکا، دارالسلام، کراتینا، یوگنڈا، ان سب کی باتیں ہوئیں۔ کہاں کا موسم اچھا ہے، کہاں کا خراب ہے، پھل کہاں اچھے ہوتے ہیں۔ پھلوں کا ذکر چھڑا تو چھوٹی نے کہا۔ ”یہاں ہندوستان میں تو نہایت ذلیل پھل ملتے ہیں۔“

”جی نہیں، بڑے اچھے پھل ملتے ہیں بشرطیکہ موسم ہو۔“ شفقت نے اپنے ہندوستان کی آبرو بچانا چاہی۔

”غلط ہے۔“ چھوٹی نے ناک چڑھائی۔ ”امی جان، یہ جوکل آپ نے مارکیٹ سے مالٹے لیے تھے، کیا وہاں کیے چنگوں کا مقابلہ کر

سکتے ہیں؟“

لڑکیوں کی ماں بولی۔ ”شفقت بیٹا، یہ صحیح کہتی ہیں۔ یہاں کے مالٹے وہاں کے چنگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

عائشہ نے چھوٹی سے پوچھا۔ ”طلعت، یہ چنگا کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ نام تو بڑا عجیب و غریب ہے۔“

طلعت مسکرائی۔ ”آپا، ایک پھل ہے، مالٹے اور بیٹھے کی طرح۔۔۔۔۔ اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ اور

رس۔۔۔۔۔ ایک نچوڑیے۔۔۔۔۔ یہ گلاس جو تپائی پر پڑا ہے، لبا لب بھر جائے۔“

شفقت نے گلاس کی طرف دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ پھل کتنا بڑا ہوگا۔ ”ایک چنگے سے اتنا بڑا گلاس بھر جاتا ہے؟“

طلعت نے بڑے فخریہ انداز سے جواب دیا۔ ”جی ہاں!“

شفقت نے یہ سن کر کہا۔ ”تو پھل یقیناً بہت بڑا ہوگا۔“

طلعت نے سر ہلایا۔ ”جی نہیں، بڑا ہوتا ہے نہ چھوٹا۔۔۔۔۔ بس آپ کے یہاں کے مالٹے کے برابر ہوتا ہے۔ یہی تو اس کی خوبی

ہے کہ رس ہی رس ہوتا ہے، اس میں۔ اور امی جان وہاں کا انناس۔۔۔۔۔ بڑی روٹی کے برابر اس کی ایک کاش ہوتی ہے۔“

دیر تک انناس کی باتیں ہوتی رہیں۔ طلعت بہت باتونی تھی۔ افریقہ سے اس کو عشق تھا۔ وہاں کی ہر چیز اس کو پسند تھی۔ بڑی جس کا نام

گلبت تھا، بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا۔ شفقت کو جب محسوس ہوا کہ وہ خاموش بیٹھی رہی ہے تو وہ اس سے

مخاطب ہوا۔ ”آپ کو غالباً ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

گھٹ نے اپنے ہونٹ کھولے۔ ”جی نہیں۔۔۔۔۔۔ سنتی رہی ہوں بڑی دلچسپی سے۔“
شفقت نے کہا۔ ”لیکن آپ بولیں نہیں۔“

عزیز کی بیوی نے جواب دیا۔ ”شفقت بیٹا اس کی طبیعت ہی ایسی ہے۔“

شفقت نے ذرا بے تکلفی سے کہا۔ ”چچی جان! اس عمر کی لڑکیوں کو خاموشی پسند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ میں میں

گھٹکنیاں ڈالے بیٹھے رہوں۔“ پھر وہ گھٹ سے مخاطب ہوا۔ ”جناب آپ کو بولنا پڑے گا۔“

گھٹ کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ”بول تو رہی ہوں بھائی جان“

شفقت مسکرایا۔ ”تصویروں سے دلچسپی ہے آپ کو؟“

گھٹ نے نگاہیں نیچے کر کے جواب دیا۔ ”جی ہے۔“

”تواٹھنے میں آپ کو اپنا البم دکھاؤں۔۔۔۔۔۔ دوسرے کمرے میں ہے۔“ یہ کہہ کر شفقت اٹھا۔ ”چلئے!“

عائشہ نے شفقت کا ہاتھ دبایا۔ پلٹ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی

اشارہ دیا جسے شفقت نہ سمجھ سکا۔ وہ متحیر تھا کہ خدا معلوم کیا بات تھی کہ اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ دبایا اور اشارہ بھی کیا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ

طلعت کھٹ سے اٹھی۔ ”چلئے بھائی جان۔۔۔۔۔۔ مجھے دوسروں کے البم دیکھنے کا بہت شوق ہے۔۔۔۔۔۔ میرے پاس بھی ایک

کولیکشن ہے۔“

شفقت، طلعت کو تصویریں دکھاتا رہا۔ حسب عادت طلعت بولتی رہی۔ شفقت کا دماغ کسی اور طرف تھا۔ وہ گھٹ کے متعلق سوچ رہا

تھا کہ وہ اس قدر خاموش کیوں ہے۔ تصویریں دیکھنے اس کے ساتھ کیوں نہ آئی۔ جب اس نے اس کو چلنے کے لیے کہا تو عائشہ نے اس کا

ہاتھ کیوں دبایا۔ اس اشارے کا کیا مطلب تھا جو اس نے آنکھوں کے ذریعے کیا تھا۔

تصویریں ختم ہو گئیں۔ طلعت نے البم اٹھایا اور شفقت سے کہا۔ ”باجی کو دکھاتی ہوں ان کو بہت شوق ہے تصویریں جمع کرنے کا۔“

شفقت پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر ان کو شوق ہے تو وہ اس کے ساتھ کیوں نہ آئیں مگر طلعت البم اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ شفقت

بڑے کمرے میں داخل ہوا تو گھٹ بڑی دلچسپی سے البم کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ ہر تصویر اس کو مسرت پہنچاتی تھی۔

عائشہ لڑکیوں کی ماں سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔ شفقت ننکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ جو پہلے ضرورت سے زیادہ سنجیدگی

کی دھند میں لپٹا تھا اب بشاش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ تصویریں جو آرٹ کا بہترین نمونہ تھیں اس کو راحت بخش رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں

اب چمک تھی۔ لیکن جب ایک گھوڑے اور صحت مند عورت کی تصویر آئی تو یہ چمک ماند پڑ گئی۔ ایک ہلکی سی آہ اس کے سینے میں لرزی اور

----- اس معصوم کا آخر گناہ کیا تھا جس کی سزا اتنی کڑی دی گئی؟“

□

سب چلے گئے۔ عائشہ ان کو باہر تک چھوڑنے لگی۔ شفقت ایک فلسفی بن کر سوچتا رہ گیا۔ اتنے میں شفقت کے دوست آگئے اور وہ بھی اپنی بیوی سے نگہت کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں ایسا مشغول ہوا کہ نگہت اور اس کے روگ کو بھول گیا۔ جب رات ہو گئی اور عائشہ نے اسے نوکر کے ذریعے کھانے پر بلوایا تو اسے افسوس ہوا کہ اس نے محض ایک کھیل کی خاطر نگہت کو فراموش کر دیا چنانچہ اس کا ذکر اس نے عائشہ سے بھی کیا، لیکن اس نے کہا۔ ”آپ کھانا کھائیے، مفصل باتیں پھر ہو جائیں گی۔“

میاں بیوی دونوں اکٹھے سوتے تھے۔ جب سے ان کی شادی ہوئی تھی وہ کبھی رات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ اور ان کی شادی کو قریب قریب چھ برس ہو گئے تھے، مگر اس دوران میں کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا یہ کہنا تھا کہ عائشہ میں کچھ قصور ہے جو صرف آپریشن سے دور ہو سکتا ہے مگر وہ اس سے بہت خائف تھی۔ میاں بیوی بہت پیار، محبت کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔

رات کو وہ اکٹھے لیتے۔ حسب معمول جب ایک دوسرے کے ساتھ لیٹے تو شفقت کو نگہت یاد آئی۔ اس نے ایک آہ بھر کر اپنی بیوی سے پوچھا۔ ”عائشہ! نگہت بے چاری کو کیا روگ ہے؟“

عائشہ نے بھی آہ بھری اور بڑے افسوسناک لہجے میں کہا۔ ”تین برس کی ننھی منی بچی تھی کہ تپ محرقہ ہوا، نچلا دھڑمفلوج ہو گیا۔“

شفقت کے دل میں نگہت کے لیے ہمدردی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوا۔

اس نے اپنی بیوی کی پیٹھ کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا اور کہا۔ ”عائشہ! خدا کیوں اتنا ظالم ہے؟“

عائشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ شفقت کو دن کے واقعات یاد آنے لگے۔ ”جب میں نے اس سے کہا تھا کہ چلو میں تمہیں الیم دکھاتا ہوں تو تم نے میرا ہاتھ اسی لیے دبایا تھا کہ-----“

”ہاں ہاں، اور کیا----- آپ تو بار بار-----“

”خدا قسم! مجھے معلوم نہیں تھا۔“

”اس کو اس بات کا بہت احساس ہے کہ وہ پانچ ہے۔“

”تم نے یہ کہا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ میرے سینے میں کسی نے تیرا رہا ہے۔“

”جب وہ آئی تو خدا کی قسم مجھے بہت دکھ ہوا۔----- بے چاری کو پیشاب کرنا تھا۔ ماں اور چھوٹی بہن ساتھ گئیں۔-----“

ازار بند کھولا۔----- پھر بند کیا۔----- کتنی خوبصورت ہے۔----- بیٹھی ہو تو خدا کی قسم بالکل پتہ نہیں چلتا کہ فالج زدہ

21

”عائشہ نے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

”تمہیں اس سے ہمدردی ہے؟“

”کیوں نہیں!“

”خدا کی قسم کھا کر کہو۔“

”ہائے، یہ بھی کوئی قسم کھلوانے کی بات ہے، ہر انسان کو اس سے ہمدردی ہونی چاہیے۔“

شفقت نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”تو میں نے ایک بات سوچی ہے۔“

عائشہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”کیا؟“

”مجھے ہمیشہ اس بات کا احساس رہا ہے کہ تم بہت بلند خیال عورت ہو۔ آج تم نے میرے اس خیال کو ثابت کر دیا ہے۔ میں نے

----- خدا میرے اس ارادے کو استقامت بخشے ----- میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں نگہت سے شادی کروں گا۔ سارا ثواب

تمہیں ملے گا۔“

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک دم جیسے گولہ سا پھٹا۔

”شفقت صاحب! میں گولی مار دوں گی اسے، اگر آپ نے اس سے شادی کی۔“

شفقت نے ایسا محسوس کیا کہ اسے زبردست گولی لگی ہے اور وہ مر کر اپنی بیوی کی آغوش میں دفن ہو گیا ہے۔



21

رحمت خداوندی کے پھول

زمیندار اخبار میں جب ڈاکٹر راتھر پر رحمت خداوندی کے پھول برستے تھے تو یار دوستوں نے غلام رسول کا نام ڈاکٹر راتھر رکھ دیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں اس لیے غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایم بی بی ایس میں تین بار فیل ہو چکا تھا، مگر کہاں ڈاکٹر راتھر کہاں غلام رسول۔

ڈاکٹر راتھر ایک اشتہاری ڈاکٹر تھا جو اشتہاروں کے ذریعے قوت مردی کی دوائیں بیچتا تھا۔ خدا اور اس کے رسول کی قسمیں کھا کھا کر اپنی دواؤں کو مجرب بتاتا تھا اور یوں سینکڑوں روپے کماتا تھا۔ غلام رسول کو ایسی دواؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کو قوت مردی بڑھانے والی چیزوں کی کوئی حاجت نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کے یار دوست اس کو ڈاکٹر راتھر کہتے تھے۔ اس کا یا کلب کو اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس لیے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اس کے بعض دوستوں کو یہ نام پسند آ گیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ غلام رسول کے مقابلے میں ڈاکٹر راتھر کہیں زیادہ ماڈرن ہے۔

اب غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر کے نام سے یاد کیا جائے گا اس لیے کہ زبان خلق کو نفاہ خدا سمجھنا چاہیے۔

ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا اور نہ بنا چاہتا تھا۔ وہ ایک اطاعت مند بیٹے کی طرح اپنے ماں باپ کی خواہش کے مطابق میڈیکل کالج میں پڑا ہوا تھا۔ اتنے عرصے سے کہ اب کالج کی عمارت اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی۔ وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ کالج اس کے کسی بزرگ کا گھر ہے جہاں اس کو ہر روز سلام عرض کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔

اس کے والدین مصر تھے کہ ڈاکٹری پاس کر لے۔ اس کے والدین کو یقین تھا کہ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اپنے بڑے لڑکے کے متعلق مولوی صباح الدین نے اپنی بیوی سے پیش گوئی کی تھی کہ وہ بیرسٹر ہوگا۔ چنانچہ جب اس کو ایل ایل بی پاس کرا کے لندن بھیجا گیا تو وہ بیرسٹر بن کر ہی آیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی پریکٹس دوسرے بیرسٹروں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔

گو ڈاکٹر راتھر تین مرتبہ ایم بی بی ایس کے امتحان میں فیل ہو چکا تھا، مگر اس کے باپ کو یقین تھا کہ وہ انجام کار بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور ڈاکٹر بنے گا اور ڈاکٹر راتھر اپنے باپ کا اس قدر فرمانبردار تھا کہ اس کو بھی یقین تھا کہ وہ ایک روز وہ لندن کے ہارلے اسٹریٹ میں بیٹھا ہوگا اور اس کی ساری دنیا میں دھوم مچی ہوگی۔

ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ سادہ لوح تھا۔ لیکن سب سے بڑی برائی اس میں یہ تھی کہ پیتا تھا اور اکیلا پیتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے بہت کوشش کی کہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہ پلائے لیکن یار دوستوں نے اس کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ان کو اس کا ٹھکانہ معلوم ہو گیا۔ ”سیوئے بار“ میں شام کو سات بجے پہنچ جاتے۔ مجبوراً ڈاکٹر راتھر کو انہیں اپنے ساتھ پلانا پڑتی۔ یہ لوگ اس کا گن گاتے، اس کے مستقبل کے متعلق بڑی حوصلہ افزا باتیں کرتے۔ راتھر نشے کی ترنگ میں بہت خوش ہوتا اور اپنی جیب خالی کر دیتا۔

پانچ چھ مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اس کو اپنے باپ سے دو سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ رہتا الگ تھا۔ مکان کا کرایہ بیس روپے ماہانہ تھا۔ دن اچھے تھے ورنہ راتھر کی بیوی کو فاقے کھینچنے پڑتے۔ لیکن پھر بھی اس کا ہاتھ تنگ ہو گیا اس لیے کہ راتھر کو دوسروں کو پلانا پڑتی تھی۔ ان دنوں شراب بہت سستی تھی۔ آٹھ روپے کی ایک بوتل ادھا چار روپے آٹھ آنے میں ملتا تھا۔ مگر ہر روز ایک ادھا لینا، یہ ڈاکٹر کی بساط سے باہر تھا۔ اس نے سوچا کہ گھر میں پیا کرے، مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ اس کی بیوی فوراً طلاق لے لیتی۔ اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا خاوند شراب کا عادی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو شرابیوں سے سخت نفرت تھی۔ ان سے بہت خوف آتا تھا۔ کسی کی سرخ آنکھیں دیکھتی تو ڈر جاتی۔ ہائے! ڈاکٹر صاحب، کتنی ڈراؤنی آنکھیں تھیں اس آدمی کی۔ ایسا لگتا تھا کہ شرابی ہے۔

اور ڈاکٹر راتھر دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں، کیا پی کر آنکھوں میں سرخ ڈورے آتے ہیں۔ کیا اس کی بیوی کو اس کی آنکھیں ابھی تک سرخ نظر نہیں آئیں۔ کب تک اس کا راز راز رہے گا۔ منہ سے بو تو ضرور آتی ہوگی۔ کیا وجہ ہے کہ اس کی بیوی نے کبھی نہیں سونگھی۔ پھر وہ سوچتا۔ ”نہیں“ میں بہت احتیاط برتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ منہ پرے کر کے اس سے بات کی ہے۔ ایک دفعہ اس نے پوچھا تھا کہ آپ کی آنکھیں آج سرخ کیوں ہیں تو میں نے اس سے کہا تھا، دھول پڑ گئی ہے۔ اسی طرح ایک بار اس نے دریافت کیا تھا، یہ بو کیسی ہے تو میں نے یہ کہہ کر نال دیا تھا، آج سگار پیا تھا۔۔۔۔۔ بہت بو ہوتی ہے کم بخت میں۔

ڈاکٹر راتھر اکیلا پینے کا عادی تھا۔ اس کو ساتھی نہیں چاہئیں تھے۔ وہ کنبوس تھا۔ اس کے علاوہ اس کی جیب بھی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ دوستوں کو پلائے۔ اس نے بہت سوچا کہ ایسی ترکیب کیا ہو سکتی ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی یہ مسئلہ کچھ اس طرح حل ہو کہ وہ گھر میں پیا کرے جہاں اس کے دوستوں کو شرکت کرنے کی جرات نہیں ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر راتھر پورا ڈاکٹر تو نہیں تھا، لیکن اس کو ڈاکٹری کی چند چیزوں کا علم ضرور تھا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ دو اعیں بوتلوں میں ڈال کر دی جاتی ہیں۔ اور ان میں اکثر یہ لکھا ہوتا ہے کہ ”شیک دی بوتل بی فور یوز“ اس نے اتنے علم پر اپنی ترکیب کی دیواریں استوار کیں۔ آخر میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نے یہ سوچا کہ وہ گھر میں ہی پیا کرے گا۔ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ وہ دووا کی بوتل میں شراب ڈلو کر گھر رکھ دے گا۔ بیوی سے کہے گا کہ اس کے سر میں درد ہے اور اس کے استاد ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے اپنے ہاتھ سے یہ نسخہ دیا ہے

اور کہا ہے کہ شام کو ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک خوراک پانی کے ساتھ پیا کرے انشاء اللہ شفا ہو جائے گی۔ □

یہ ترکیب تلاش کر لینے پر ڈاکٹر اتھر بے حد خوش ہوا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس نے ایک نیا امریکہ دریافت کر لیا ہے چنانچہ صبح سویرے اٹھ کر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”نسیہ! آج میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے پھٹ جائے گا۔“

نسیہ نے بڑے تردد سے کہا۔ ”کالج نہ جائیے آج“

ڈاکٹر اتھر مسکرایا۔ ”بگلی! آج مجھے ضرور جانا ہے۔ ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ صاحب سے پوچھوں گا ان کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔“
 ”ہاں ہاں ضرور جائیے۔۔۔۔۔۔ میرے متعلق بھی ان سے بات کیجئے گا۔“

نسیہ کو سیلان الرحم کی شکایت تھی جس سے ڈاکٹر اتھر کو کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر اس نے کہا۔ ”ہاں ہاں بات کروں گا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میرے لیے کوئی نہایت ہی کڑوی اور بدبودار دوا تجویز کر دیں گے۔“

”آپ خود ڈاکٹر ہیں دوائیاں مٹھائیاں تو نہیں ہوتیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن بدبودار دواؤں سے مجھے نفرت ہے۔“

”آپ دیکھئے تو سہی کیسی دوا دیتے ہیں۔ ابھی سے کیوں رائے قائم کر رہے ہیں آپ؟“

”اچھا“ کہہ کر ڈاکٹر اتھر اپنے سر کو دبا تاکا کالج چلا گیا۔ شام کو وہ دوا کی بوتل میں دسکی ڈلوا کر لے آیا اور اپنی بیوی سے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ ضرور کوئی ایسی دوا لکھ کر دیں گے جو بے حد کڑوی اور بدبودار ہوگی۔ لؤ ذرا اسے سونگھو۔“ بوتل کا کارک اتار کر اس نے بوتل کا منہ اپنی بیوی کی ناک کے ساتھ لگا دیا۔ اس نے سونگھا اور ایک دم ناک ہٹا کر کہا۔ ”بہت واہیات سی بو ہے۔“

”اب ایسی دوا کون پیئے!“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔ آپ ضرور پیئیں گے۔۔۔۔۔۔ سر کا درد کیسے دور ہوگا؟“

”ہو جائے گا اپنے آپ۔“

”اپنے آپ کیسے دور ہوگا۔ یہی تو آپ کی بری عادت ہے۔ دوالا تے ہیں مگر استعمال نہیں کرتے۔“

”یہ بھی کوئی دوا ہے۔ ایسا لگتا ہے شراب ہے۔“

”آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انگریزی دواؤں میں شراب ہوا کرتی ہے۔“

”لغت ہے ایسی دواؤں پر۔“

21

ڈاکٹر اتھر کی بیوی نے خوراک کے نشان دیکھے اور حیرت سے کہا۔ ”اتنی بڑی خوراک!“

ڈاکٹر اتھر نے برسا منہ بنایا۔ ”یہی تو مصیبت ہے۔“

”آپ مصیبت مصیبت نہ کہیں! اللہ کا نام لے کر پہلی خوراک پیئیں۔۔۔۔۔۔ پانی کتنا ڈالنا ہے؟“

ڈاکٹر اتھر نے بوتل اپنی بیوی کے ہاتھ سے لی اور مصنوعی طور پر بادل نخواستہ کہا۔ ”سو ڈالنا پڑے گا۔۔۔۔۔۔ عجیب و غریب

دوا ہے۔۔۔۔۔۔ پانی نہیں سو ڈا۔“

یہ سن کر نسیم نے کہا۔ ”سو ڈا اس لیے کہا ہوگا کہ آپ کا معدہ خراب ہے۔“

”خدا معلوم کیا خراب ہے۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر اتھر نے ایک خوراک گلاس میں ڈالی۔ ”بھئی خدا کی قسم! میں نہیں پیوں گا۔“

بیوی نے بڑے پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔ پی جائیے۔۔۔۔۔۔ ناک بند کر لیجئے

۔۔۔۔۔۔ میں اسی طرح فیورکسچر پیا کرتی ہوں۔“

ڈاکٹر اتھر نے بڑے غمزوں کے ساتھ شام کا پہلا پیگ پیا۔ بیوی نے اس کو شاباش دی اور کہا۔ ”پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک۔

خدا کے فضل و کرم سے درد یوں چٹکیوں میں دور ہو جائے گا۔“

ڈاکٹر اتھر نے سارا ڈھونگ کچھ ایسے خلوص سے رچایا تھا کہ اس کو محسوس ہی نہ ہوا کہ اس نے دوا کی بجائے شراب پی ہے، لیکن جب

ہلکا سا سردی اس کے دماغ میں نمودار ہوا تو وہ دل ہی دل میں خوب ہنسا۔ ترکیب خوب تھی۔ اس کی بیوی نے عین پندرہ منٹ کے بعد

دوسری خوراک گلی میں انڈیلی اس میں سو ڈا ڈالا اور ڈاکٹر اتھر کے پاس لے آئی۔ ”یہ لیجئے، دوسری خوراک۔۔۔۔۔۔ کوئی ایسی بری بوتلو

نہیں ہے۔“

ڈاکٹر اتھر نے گلاس پکڑ کر بڑی بددلی سے کہا۔ ”تمہیں پینا پڑے تو معلوم ہو۔ خدا کی قسم شراب کی سی بو ہے۔ ذرا سونگھ کر تو دیکھو۔“

”آپ تو بالکل میری طرح ضد کرتے ہیں۔“

”نسیم! خدا کی قسم ضد نہیں کرتا۔ ضد کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، لیکن۔۔۔۔۔۔ خیر، ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر اتھر نے گلاس

منہ سے لگایا اور شام کا دوسرا پیگ غنا غٹ چڑھا گیا۔

تین خوراکیں ختم ہو گئیں۔ ڈاکٹر اتھر نے کسی قدر افاقہ محسوس کیا، لیکن دوسرے روز پھر سر میں درد عود کر آیا۔ ڈاکٹر اتھر نے اپنی بیوی

سے کہا۔ ”ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے کہا کہ یہ مرض آہستہ آہستہ دور ہوگا، لیکن دوا کا استعمال برابر جاری رہنا چاہیے۔ خدا معلوم کیا نام لیا تھا“

انہوں نے بیماری کا کہا تھا کہ معمولی سر کا درد ہوتا تو دوا خوراکوں ہی سے دور ہو جاتا، مگر تمہارا کیس ذرا سیریس ہے۔“

21

یہ سن کر نسیہ نے تردد سے کہا۔ ”تو آپ کو دو اب باقاعدہ پینی پڑے گی؟“

”میں نہیں جانتا۔ تم وقت پر دے دیا کرو گی تو قہر درویش برجان درویش پی لیا کروں گا۔“

نسیہ نے ایک خوراک سوڈے میں حل کر کے اس کو دی۔ اس کی بوتاک میں گھسی تو متلی آنے لگی مگر اس نے اپنے خاوند پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا کیوں کہ اس کو ڈر تھا کہ وہ پینے سے انکار کر دے گا۔

ڈاکٹر اتھرنے تین خوراکیں اپنی بیوی کے بڑے اصرار پر لیں۔ وہ بہت خوش تھی کہ اس کا خاوند اس کا کہا مان رہا ہے کیوں کہ بیوی کی بات ماننے کے معاملے میں ڈاکٹر بہت بدنام تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ خوراکیں پینے اور پلانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ ڈاکٹر اتھرنے بڑا مسرور تھا کہ اس کی ترکیب سود مند ثابت ہوئی۔ اب اسے دوستوں کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ ہر شام گھر میں بسر ہوتی۔ ایک خوراک پیتا اور لیٹ کر کوئی افسانہ پڑھنا شروع کر دیتا۔ دوسری خوراک عین پندرہ منٹ کے بعد اس کی بیوی تیار کر کے لے آتی۔ اسی طرح تیسری خوراک اس کو بن مانگے مل جاتی۔ ڈاکٹر اتھرنے بے حد مطمئن تھا۔ اتنے دن گزر جانے پر اس کے اور اس کی بیوی کے لیے یہ دوا کا سلسلہ ایک معمول ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر اتھرنے ایک پوری بوتل لے آیا تھا۔ اس کا لیبل وغیرہ اتار کر اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا۔ ”کیسٹ میرا دوست ہے اس نے مجھ سے کہا آپ ہر روز تین خوراکیں لیتے ہیں، دوا آپ کو مہنگی پڑتی ہے، پوری بوتل لے جائیے۔ اس میں سے چھوٹی نشانوں والی بوتل میں ہر روز تین خوراکیں ڈال لیا کیجئے۔۔۔۔۔۔ بہت سستی پڑے گی اس طرح آپ کو یہ دوا۔“

یہ سن کر نسیہ کو خوشی ہوئی کہ چلو بچت ہو گئی۔ ڈاکٹر اتھرنے بھی خوش تھا کہ اس کے کچھ پیسے بچ گئے کیونکہ روزانہ تین پیگ لینے میں اسے زیادہ دام دینے پڑتے تھے اور بوتل آٹھ روپوں میں مل جاتی تھی۔

کالج سے فارغ ہو کر ڈاکٹر اتھرنے ایک دن گھر آیا تو اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اتھرنے اس سے کہا۔ ”نسیہ کھانا نکالو، بہت بھوک لگی ہے۔“

نسیہ نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”کھانا۔۔۔۔۔۔ کیا آپ کھانا کھا نہیں چکے؟“

”نہیں تو“

نسیہ نے ایک لمبی ”نہیں“ کہی۔ ”آپ۔۔۔۔۔۔ کھانا کھا چکے ہیں۔۔۔۔۔۔ میں نے آپ کو دیا تھا۔“

ڈاکٹر اتھرنے حیرت سے کہا۔ ”کب دیا تھا؟ میں ابھی کالج سے آ رہا ہوں۔“

نسیہ نے ایک جمائی لی۔ ”جھوٹ ہے۔۔۔۔۔۔ آپ تو کالج گئے ہی نہیں۔“

لطیفہ بیان کر رہا ہے۔“ تو مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ میں نے یہ سمجھا جیسے رضوی نے میرے خیالات کی ترجمانی کر دی۔

کریم ملی ہوئی کافی کی۔ پیالی ختم کر کے رضوی نے اپنی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”منٹو صاحب! آدمی جرم کیوں کرتا ہے۔ جرم کیا ہے سزا کیا ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے اس کے متعلق بہت غور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر جرم کے پیچھے ایک ہسٹری ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ زندگی کے واقعات کا ایک بہت بڑا ٹکڑا ہوتا ہے، بہت الجھا ہوا، میزھا میڑھا۔۔۔۔۔۔ میں نفسیات کا ماہر نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسان سے خود جرم سرزد نہیں ہوتا۔ حالات سے ہوتا ہے۔“

نصیر نے کہا۔ ”آپ نے بالکل درست کہا ہے۔“

رضوی نے ایک اور کافی کا آرد ڈر دیا اور نصیر سے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں جناب، لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، اپنے مشاہدات کی بنا پر عرض کیا ہے ورنہ یہ موضوع بہت پرانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر ہیوگو۔۔۔۔۔۔ فرانس کا ایک مشہور ناولسٹ تھا۔۔۔۔۔۔ شاید کسی اور ملک کا ہو۔۔۔۔۔۔ آپ تو خیر جانتے ہی ہوں گے، جرم اور سزا پر اس نے کافی لکھا ہے۔ مجھے اس کی ایک تصنیف کے چند فقرے یاد ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”منٹو صاحب، غالباً آپ ہی کا ترجمہ تھا۔۔۔۔۔۔ کیا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ سیزمی اتار دو جو انسان کو جرائم اور مصائب کی طرف لے جاتی ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ وہ سیزمی کون سی ہے۔ اس کے کتنے زینے ہیں۔

کچھ بھی ہو، یہ سیزمی ضرور ہے۔ اس کے زینے بھی ہیں۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بے شمار ہیں۔ ان کو گننا ان کا شمار کرنا ہی سب سے بڑی بات ہے۔ منٹو صاحب، حکومتیں رائے شماری کرتی ہیں، حکومتیں اعداد و شمار کرتی ہیں، حکومتیں رائے شماری کرتی ہیں، حکومتیں اعداد و شمار کرتی ہیں، حکومتیں ہر قسم کی شماری کرتی ہیں۔ اس سیزمی کے زینوں کی شماری کیوں نہیں کرتیں۔ کیا یہ ان کا فرض نہیں۔ میں نے قتل کیا۔۔۔۔۔۔ لیکن اس سیزمی کے کتنے زینے طے کر کے کیا۔ حکومت نے مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیا، اس لیے کہ قتل کا ثبوت اس کے پاس نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں اپنے گناہ کی معافی کس سے مانگوں۔ وہ حالات جنہوں نے مجھے قتل کرنے پر مجبور کیا تھا، اب میرے نزدیک نہیں ہیں۔ ان میں اور مجھ میں ایک برس کا فاصلہ ہے۔ میں اس فاصلے سے معافی مانگوں یا ان حالات سے جو بہت دور کھڑے میرا منہ چڑا رہے ہیں؟“

ہم سب رضوی کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ وہ بظاہر تعلیم یافتہ معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن اس کی گفتگو سے ثابت ہوا کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ میں نے اس سے کچھ کہتا ہوتا، لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں۔ اسی لیے میں اس کی گفتگو میں حائل نہ ہوا۔ اس کے لیے نئی کافی آگئی تھی۔ اسے بنا کر اس نے چند گھونٹ پیئے اور کہنا شروع کیا۔ ”خدا معلوم میں کیا بکواس کرتا رہا ہوں، لیکن میرے ذہن میں ہر وقت ایک آدمی کا خیال رہا ہے۔ اس آدمی کا اس بھنگی کا جو ہمارے ساتھ جیل میں تھا۔ اس

کو ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر ایک برس سزا ہوئی تھی۔“

□

نصیر نے حیرت سے پوچھا۔ ”صرف ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر!“

رضوی نے بیخ آلود جواب دیا۔ ”جی ہاں۔۔۔۔۔۔ صرف ساڑھے تین آنے کی چوری پر۔۔۔۔۔۔ اور جو اس کو نصیب نہ ہوئے، کیونکہ وہ پکڑا گیا۔۔۔۔۔۔ یہ رقم خزانے میں محفوظ ہے اور پھلو بھنگلی غیر محفوظ ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ پھر پکڑا جائے۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے اس کا پیٹ پھر اسے مجبور کرے۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ اس سے گومت صاف کرانے والے اس کی تنخواہ نہ دے سکیں۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے اس کو تنخواہ دینے والوں کو اپنی تنخواہ نہ ملے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ سلسلہ منٹو صاحب عجیب و غریب ہے۔ سچ پوچھئے تو دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ رضوی سے قتل بھی ہو سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ تھوڑے عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ نصیر نے اس سے کہا۔ ”آپ پھلو کی بات کر رہے تھے۔“

رضوی نے اپنی چھدری مونچھوں پر سے کافی رومال کے ساتھ پونجھی۔ ”جی ہاں۔۔۔۔۔۔ پھلو بھنگلی چور ہونے کے باوجود یعنی وہ قانون کی نظروں میں چور تھا، لیکن ہماری نظروں میں پورا ایماندار۔۔۔۔۔۔ خدا کی قسم! میں نے آج تک اس جیسا ایماندار آدمی نہیں دیکھا۔ ساڑھے تین آنے اس نے ضرور چرائے تھے۔ اس نے صاف صاف عدالت میں کہہ دیا تھا کہ یہ چوری میں نے ضرور کی ہے، میں اپنے حق میں کوئی گواہی پیش نہیں کرنا چاہتا۔ میں دو دن کا بھوکا تھا، مجبوراً مجھے کریم درزی کی جیب میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ اس سے مجھے پانچ روپے لینے تھے۔۔۔۔۔۔ دو مہینوں کی تنخواہ۔۔۔۔۔۔ حضور اس کا بھی کچھ قصور نہیں تھا، اس لیے کہ اس کے کئی گاہکوں نے اس کی سلائی کے پیسے مارے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔ حضور میں پیسے بھی چور یاں کر چکا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے دس روپے ایک میم صاحب کے بٹوے سے نکال لیے تھے۔ مجھے ایک مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ پھر میں نے ڈپٹی صاحب کے گھر سے چاندی کا ایک کھلونا چرایا تھا اس لیے کہ میرے بچے کو نمونیا تھا اور ڈاکٹر بہت فیس مانگتا تھا۔ حضور میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ میں چور نہیں ہوں۔ کچھ حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے چور یاں کرنی پڑیں۔۔۔۔۔۔ اور حالات ہی ایسے تھے کہ میں پکڑا گیا۔ مجھ سے بڑے بڑے چور موجود ہیں لیکن وہ ابھی تک پکڑے نہیں گئے۔ حضور اب میرا بچہ بھی نہیں ہے، بیوی بھی نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ میرا پیٹ ہے، یہ مر جائے تو سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو جائے، حضور مجھے معاف کر دو۔ لیکن حضور نے اس کو معاف نہ کیا اور عادی چور سمجھ کر اس کو ایک برس قید با مشقت کی سزا دے دی۔“

رضوی بڑے بے تکلف انداز میں بول رہا تھا۔ اس میں کوئی تصنع، کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ الفاظ خود بخود اس کی زبان پر آتے اور بہتے چلے جا رہے تھے۔ میں بالکل خاموش تھا۔ سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ نصیر پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ”آپ پھلو کی ایمانداری کی بات کر رہے تھے۔“

”جی ہاں!“ رضوی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی۔ ”میں نہیں جانتا‘ قانون کی نگاہوں میں ایمانداری کیا ہے۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے بڑی ایمانداری سے قتل کیا تھا۔۔۔۔۔۔ اور میرا خیال ہے کہ پھلو بھنگی نے بھی بڑی ایمانداری سے ساڑھے تین آنے چرائے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ایمانداری کو صرف اچھی باتوں سے کیوں منسوب کرتے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو میں اب یہ سوچنے لگا ہوں کہ اچھائی اور برائی ہے کیا۔ ایک چیز آپ کے لیے اچھی ہو سکتی ہے، میرے لیے بری۔ ایک سوسائٹی میں ایک چیز اچھی سمجھی جاتی ہے، دوسری میں بری۔ ہمارے مسلمانوں میں بغلوں کے گناہ بڑھانا گناہ سمجھا جاتا ہے، لیکن سکھ اس سے بے نیاز ہیں۔ اگر یہ بال بڑھانا واقعی گناہ ہے تو خدا ان کو سزا کیوں نہیں دیتا۔ اگر کوئی خدا ہے تو میری اس سے درخواست ہے کہ خدا کے لیے تم یہ انسانوں کے قوانین توڑ دو، ان کی بنائی ہوئی جیلیں ڈھا دو۔۔۔۔۔۔ اور آسمانوں پر اپنی جیلیں خود بناؤ۔ خود اپنی عدالت میں ان کو سزا دو، کیوں کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم خدا تو ہو۔“

رضوی کی اس تقریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی خام کاری ہی اصل میں تاثر کا باعث تھی۔ وہ باتیں کرتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ ہم میں سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے دل ہی دل میں گفتگو کر رہا ہے۔

اس کی بیڑی بجھ گئی تھی۔ غالباً اس میں تمباکو کی گانٹھ انکی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ اس نے پانچ مرتبہ اس کو سلگانے کی کوشش کی۔ جب نہ سلگی تو چیپنک دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”منٹو صاحب! پھلو مجھے اپنی تمام زندگی یاد رہے گا۔ آپ کو بتاؤں گا تو آپ ضرور کہیں گے کہ جذباتیت ہے، لیکن خدا کی قسم! جذباتیت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ وہ میرا دوست نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ نہیں، وہ میرا دوست تھا کیونکہ اس نے ہر بار خود کو ایسا ہی ثابت کیا۔“

رضوی نے جیب میں سے دوسری بیڑی نکالی مگر وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سگریٹ پیش کیا تو اس نے قبول کر لیا۔ ”شکریہ۔۔۔۔۔۔ منٹو صاحب، معاف کیجئے گا، میں نے اتنی بکواس کی ہے، حالانکہ مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی، اس لیے کہ ماشاء اللہ آپ۔۔۔۔۔۔“

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”رضوی صاحب! میں اس وقت منٹو نہیں ہوں، صرف سعادت حسن ہوں۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھئے، میں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں۔“

رضوی مسکرایا۔ ”اس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔“ ”آپ کی بڑی نوازش ہے۔“ پھر وہ نصیر سے مخاطب ہوا۔ ”میں کیا کہہ رہا تھا۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”پھلو کی ایمانداری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے۔“

”جی ہاں!“ یہ کہہ کر اس نے میرا پیش کیا ہوا سگریٹ سلگایا۔ ”منٹو صاحب! قانون کی نظروں میں وہ عادی چوتھا۔ بیڑیوں کے لیے اس نے ایک دفعہ آٹھ آنے چرائے تھے بڑی مشکلوں سے دیوار پھاند کر جب اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی تو اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ قریب قریب ایک برس تک وہ اس کا علاج کراتا رہا تھا مگر جب میرا ہم الزام دوست جرجی بیس بیڑیاں اس کی معرفت بھیجتا تو وہ سب کی سب پولیس کی نظریں بچا کر میرے حوالے کر دیتا۔ وعدہ معاف گواہوں پر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے لیکن جرجی نے پھگو کو اپنا دوست اور ہماز بنا لیا تھا۔ وہ بھنگی تھا، لیکن اس کی فطرت بہت خوشبودار تھی۔ شروع شروع میں جب وہ جرجی کی بیڑیاں لے کر میرے پاس آیا تو میں نے سوچا اس حرامزادے چور نے ضرور ان میں سے کچھ غائب کر لی ہوں گی۔ مگر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ قطعی طور پر ایماندار تھا۔ بیڑی کے لیے اس نے آٹھ آنے چراتے ہوئے اپنے ٹخنے کی ہڈی تڑوالی تھی، مگر یہاں جیل میں جہاں اس تمباکو کو کہیں سے بھی نہیں مل سکتا تھا، وہ جرجی کی دی ہوئی بیڑیاں تمام وکمال میرے حوالے کر دیتا تھا۔ جیسے وہ امانت ہوں۔۔۔۔۔ پھر وہ کچھ ہچکچانے کے بعد مجھ سے کہتا، بابو جی، ایک بیڑی تو دیجئے اور میں اس کو صرف ایک بیڑی دیتا۔۔۔۔۔ انسان بھی کتنا کمینہ ہے!“

رضوی نے کچھ اس انداز سے اپنا سر جھککا جیسے وہ اپنے آپ سے متنفر ہے۔ ”جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، مجھ پر بہت کڑی پابندی عائد تھیں۔ وعدہ معاف گواہوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جرجی البتہ میرے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔ اس کو رشوت دے دلا کر بہت آسانیاں مہیا تھیں۔ کپڑے مل جاتے تھے۔ صابن مل جاتا تھا۔ بیڑیاں مل جاتی تھیں۔ جیل کے اندر رشوت دینے کے لیے روپے بھی مل جاتے تھے۔ پھگو بھنگی کی سزا ختم ہونے میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے۔ جب اس نے آخری بار جرجی کی دی ہوئی بیس بیڑیاں مجھے لا کر دیں۔ میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا۔ وہ جیل سے نکلنے پر خوش نہیں تھا۔ میں نے جب اس کو مبارکباد دی تو اس نے کہا۔ ”بابو جی! میں پھر یہاں آ جاؤں گا۔ بھوکے انسان کو چوری کرنی پڑتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک بھوکے انسان کو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے۔ بابو جی، آپ بڑے اچھے ہیں، مجھے اتنی بیڑیاں دیتے رہے۔ خدا کرے آپ کے سارے دوست بری ہو جائیں۔ جرجی بابو آپ کو بہت چاہتے ہیں۔“

نصیر نے یہ سن کر غالباً اپنے آپ سے کہا۔ ”اور اس کو صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں سزا ملی تھی۔“

رضوی نے گرم کافی کا ایک گھونٹ پی کر ٹھنڈے انداز میں کہا۔ ”جی ہاں، صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں۔۔۔۔۔ اور وہ بھی خزانے میں جمع ہیں۔۔۔۔۔ خدا معلوم ان سے کس پیٹ کی آگ بجھے گی۔“ رضوی نے کافی کا ایک اور گھونٹ پیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ہاں منٹو صاحب! اس کی رہائی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ مجھے دس روپوں کی اشد ضرورت تھی۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے یہ روپے ایک سلسلے میں سنتری کو رشوت کے طور پر دینے تھے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے کاغذ پنسل مہیا کر کے جرجی کو ایک خط لکھا تھا اور پھگو کے ذریعے اس تک بھجوایا تھا کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح دس روپے بھیجے۔ پھگو ان پڑھ تھا۔ شام وہ مجھ سے ملا۔ جرجی کا رقعہ اس نے مجھے دیا۔ اس میں دس روپے کا سرخ پاکستانی نوٹ قید تھا۔ میں نے رقعہ پڑھا۔ یہ لکھا تھا۔ ”رضوی! پیارے دس روپے بھیج تو رہا

ہوں، مگر ایک عادی چور کے ہاتھ۔ خدا کرے تمہیں مل جائیں کیونکہ یہ کل ہی جیل سے رہا ہو کر جا رہا ہے۔“

□ میں نے یہ تحریر پڑھی تو پھلو بھنگی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”اس کو ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں ایک برس کی سزا ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر اس نے دس روپے چرائے ہوتے تو ساڑھے تین آنے فی برس کے حساب سے اس کو کیا سزا ملتی!

یہ کہہ کر رضوی نے کافی کا آخری گھونٹ پیا اور رخصت مانگے بغیر کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔



21

پیرن

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں بے حد مفلس تھا۔ بمبئی میں نور پے ماہوار کی ایک کھولی میں رہتا تھا جس میں پانی کا تل تھا نہ بجلی۔ ایک نہایت ہی غلیظ کوٹھڑی تھی جس کی چھت پر سے ہزار ہا کھنٹل میرے اوپر گرا کرتے تھے۔ چوہوں کی بھی کافی بہتات تھی۔۔۔۔۔۔ اتنے بڑے چوہے میں نے پھر کبھی نہیں دیکھے۔ بلیاں ان سے ڈرتی تھیں۔

چالی یعنی بلڈنگ میں صرف ایک غسل خانہ تھا۔ جس کے دروازے کی کنڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ صبح سویرے چالی کی عورتیں پانی بھرنے کے لیے اس غسل خانے میں جمع ہو جاتی تھیں۔ یہودی، مرہٹی، گجراتی، کرشنین۔۔۔۔۔۔ بھانت بھانت کی عورتیں۔

میرا یہ معمول تھا کہ ان عورتوں کے اجتماع سے بہت پہلے غسل خانے میں جاتا، دروازہ بھینڑتا اور نہانا شروع کر دیتا۔ ایک روز میں دیر سے اٹھا غسل خانے میں پہنچ کر نہانا شروع کیا تو تھوڑی دیر کے بعد کھٹ سے دروازہ کھلا۔ میری پڑوسن تھی۔ بغل میں گاگرد بائے، اس نے معلوم نہیں کیوں ایک لفظ کے لیے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر ایک دم پلٹی، گاگرد اس کی بغل سے پھسل اور فرش پر اڑھکنے لگی۔ ایسی بھاگی جیسے کوئی شیر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ میں بہت ہنسا، اٹھ کر دروازہ بند کیا اور نہانا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا برجموہن تھا۔ میں نہا کے فارغ ہو چکا تھا اور کپڑے پہن رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”بھئی منٹو آج اتوار ہے۔“

مجھے یاد آ گیا کہ برج موہن کو باند رہا تھا، اپنی دوست پیرن سے ملنے کے لیے۔ وہ ہر اتوار کو اس سے ملنے جاتا تھا۔ وہ ایک معمولی شکل و صورت کی پارسی لڑکی تھی جس سے برجموہن کا عاشقہ قریباً تین برس سے چل رہا تھا۔

ہر اتوار کو برج موہن مجھ سے آٹھ آنے ٹرین کے کرائے کے لیے لیتا۔ پیرن کے گھر پہنچتا۔ دونوں آدھے گھنٹے تک آپس میں باتیں کرتے۔ برجموہن الشریٹڈ ویلی کے کراس ورڈ پزل کے حل اس کو دیتا اور چلا آتا۔ وہ بیکار تھا۔ سارا دن مرنیوڑھائے یہ پزل اپنی دوست پیرن کے لیے حل کرتا رہتا تھا۔ اس کو چھوٹے چھوٹے کئی انعام مل چکے تھے۔ مگر وہ سب پیرن نے وصول کئے تھے۔ برج موہن نے ان میں سے ایک دمزی بھی اس سے نہ مانگی تھی۔

برج موہن کے پاس پیرن کی بے شمار تصویروں تھیں۔ شلواری میض میں، چست پاجامے میں، ساڑھی میں، فرائک میں، بیڈنگ کا سٹیوم میں،

فینسی ڈریس میں۔ غالباً سوسے اوپر ہوں گی۔ پیرن قطعاً خوبصورت نہیں تھی، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ بہت ہی ادنیٰ شکل و صورت کی تھی لیکن میں نے اپنی اس رائے کا اظہار برج موہن سے کبھی نہیں کیا تھا۔ میں نے پیرن کے متعلق کبھی کچھ پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے کیا کرتی ہے، برج موہن سے اس کی ملاقات کیسے ہوئی، عشق کی ابتدا کیوں کر ہوئی۔ کیا وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ برج موہن نے بھی اس کے بارے میں مجھ سے کبھی بات چیت نہ کی تھی۔ بس ہر اتوار کو وہ ناشتے کے بعد مجھ سے آٹھ آنے کرائے کے لیتا اور اس سے ملنے کے لیے باندروہ روانہ ہو جاتا اور دوپہر تک لوٹ آتا۔

میں نے کھولی میں جا کر اس کو آٹھ آنے دیئے۔ وہ چلا گیا۔ دوپہر کو لوٹا تو اس نے خلاف معمول مجھ سے کہا۔ ”آج معاملہ ختم ہو گیا۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کونسا معاملہ؟“ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس معاملے کی بات کر رہا ہے۔

برج موہن نے جیسے اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ مجھ سے کہا۔ ”پیرن سے آج دو ٹوک فیصلہ ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ جب بھی تم سے ملنا شروع کرتا ہوں مجھے کوئی کام نہیں ملتا۔ تم بہت منحوس ہو۔ اس نے کہا بہتر ہے ملنا چھوڑ دو۔ دیکھوں گی تمہیں کیسے کام ملتا ہے۔ میں منحوس ہوں، مگر تم اول درجے کے نکٹھو اور کام چور ہو۔ سواب یہ قصہ ختم ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے انشاء اللہ کل ہی مجھے کام مل جائے گا۔ صبح تم مجھے چار آنے دینا۔ میں سیٹھ نانو بھائی سے ملوں گا وہ مجھے ضرور اپنا اسسٹنٹ رکھ لے گا۔“

یہ سیٹھ نانو بھائی جو فلم ڈائریکٹر تھا۔ متعدد مرتبہ برج موہن کو ملازمت دینے سے انکار کر چکا تھا۔ کیونکہ اس کا بھی پیرن کی طرح یہی خیال تھا کہ وہ کام چور اور نکٹھا ہے لیکن دوسرے روز جب برج موہن مجھ سے چار آنے لے کر گیا تو دوپہر کو اس نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ سیٹھ نانو بھائی نے بہت خوش ہو کر اسے ڈھائی سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا ہے۔ کنٹریکٹ ایک برس کا ہے۔ جس پر دستخط ہو چکے ہیں۔“ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ال کر سو روپے نکالے اور مجھے دکھائے۔ ”یہ ایڈوانس ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ کنٹریکٹ اور سو روپے لے کر باندروہ جاؤں اور پیرن سے کہوں کہ لو دیکھو، مجھے کام مل گیا ہے۔ لیکن ڈر ہے کہ نانو بھائی مجھے فوراً جواب دیدے گا۔ میرے ساتھ ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ ادھر ملازمت ملی، ادھر پیرن سے ملاقات ہوئی۔ معاملہ صاف۔ کسی نہ کسی بہانے مجھے نکال باہر کیا گیا۔ خدا معلوم اس لڑکی میں یہ نحوست کہاں سے آگئی۔ اب میں کم از کم ایک برس تک اس کا منہ نہیں دیکھوں گا۔ میرے پاس کپڑے بہت کم رہ گئے ہیں، ایک برس لگا کر کچھ بنوا لوں تو پھر دیکھا جائے گا۔“

چھ مہینے گزر گئے۔ برج موہن برابر کام پر جا رہا تھا اس نے کئی نئے کپڑے بنوائے تھے۔ ایک درجن رومال بھی خرید لیے تھے۔ اب وہ تمام چیزیں اس کے پاس تھیں جو ایک کنوارے آدمی کے آرام و آسائش کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک روز وہ اسٹڈیو گیا ہوا تھا کہ اس کے نام ایک خط آیا۔ شام کو جب وہ لوٹا تو میں اسے یہ خط دینا بھول گیا۔ صبح ناشتے پر مجھے یاد آیا تو میں نے یہ خط اس کے حوالے کر دیا۔ لفافہ

□

”جواب مل گیا بھائی۔“

میں نے سمجھا مذاق کر رہا ہے ”ہٹاؤ جی“

”جو ہٹنا تھا وہ تو ہٹ گیا۔ اب کے ہٹاؤں۔ سیٹھ نانو بھائی پر ٹانچ آگئی ہے۔ اسٹڈیوسل ہو گیا ہے۔ میری وجہ سے خواہ مخواہ بیچارے

نانو بھائی پر بھی آفت آئی۔“ یہ کہہ کر برج موہن پھر ہنسنے لگا۔

میں نے صرف اتنا کہا۔ ”یہ عجیب سلسلہ ہے“

”دیکھ لو اسے کہتے ہیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا“ برج موہن نے سگریٹ سلگایا اور کیمرا اٹھا کر باہر گھومنے چلا گیا۔

برج موہن اب بیکار تھا۔ جب اس کی جمع پونجی ختم ہو گئی تو اس نے ہر اتوار کو پھر مجھ سے باندرہ جانے کے لیے آٹھ آنے مانگنے شروع کر

دیئے۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں آدھ پون گھنٹے میں وہ پیرن سے کیا باتیں کرتا تھا۔ ویسے وہ بہت اچھی گفتگو کرنے والا تھا۔ مگر اس لڑکی سے

جس کی نحوست کا اس کو مکمل طور پر یقین تھا۔ وہ کس قسم کی باتیں کرتا تھا۔ میں نے ایک روز اس سے پوچھا۔

”برج‘ کیا پیرن کو بھی تم سے محبت ہے۔؟“

”نہیں، وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔“

”تم سے کیوں ملتی ہے۔؟“

”اس لیے کہ میں ذہین ہوں، اس کے بھدے چہرے کو خوبصورت بنا کر پیش کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے کراس ورڈ پزل حل کرتا ہوں۔“

کبھی کبھی اس کو انعام بھی دلوادیتا ہوں۔ منٹو، تم نہیں جانتے ان لڑکیوں کو۔ میں خوب پہچانتا ہوں انہیں۔ جس سے وہ محبت کرتی ہے، اس میں

جو کمی ہے، مجھ سے مل کر پوری کر لیتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ”بڑی چار سو بیس ہے!“

میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ مگر تم کیوں اس سے ملتے ہو؟

برج موہن ہنسا، چشمے کے پیچھے اپنی آنکھیں سکوڑ کر اس نے کہا ”مجھے مزا آتا ہے“

”کس بات کا؟“

”اس کی نحوست کا میں اس کا امتحان لے رہا ہوں۔ اس کی نحوست کا امتحان۔ یہ نحوست اپنے امتحان میں پوری اتری ہے۔ میں نے

جب بھی اس سے ملنا شروع کیا، مجھے اپنے کام سے جواب ملا۔ اب میری ایک منحوس خواہش ہے کہ اس کے منحوس اثر کو چکمہ دے جاؤں۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

برج موہن نے بڑی سنجیدگی سے کہا ”میرا یہ جی چاہتا ہے کہ ملازمت سے جواب ملنے سے پہلے ملازمت سے علیحدہ ہو جاؤں، یعنی خود

اپنے آقا کو جواب دیدوں۔ اس سے بعد میں کہوں، جناب مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھے برطرف کرنے والے ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کو زحمت نہ دی اور خود علیحدہ ہو گیا اور آپ مجھے برطرف نہیں کر رہے تھے یہ میری دوست پیرن تھی جس کی ناک کیمرے میں اس طرح گھستی ہے جیسے تیر۔“

برج موہن مسکرایا۔ ”یہ میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے، دیکھو پوری ہوتی ہے یا نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”عجیب و غریب خواہش ہے۔“

”میری ہر چیز عجیب و غریب ہوتی ہے۔ پچھلی اتوار میں نے پیرن کے اس دوست کے لیے جس سے وہ محبت کرتی ہے ایک فوٹو تیار کر کے دیا۔ لوکی دم اسے کمپی ٹیشن میں بھیجے گا۔ یقینی طور پر انعام ملے گا اسے۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

برج موہن واقعی عجیب و غریب آدمی تھا۔ وہ پیرن کے دوست کو کئی بار فوٹو تیار کر کے دے چکا ہے۔ اسٹریڈ ویلگی میں یہ فوٹو اس کے نام سے چھپتے تھے اور پیرن بہت خوش ہوتی تھی۔ برج موہن ان کو دیکھتا تھا تو مسکراتا تھا۔ وہ پیرن کے دوست کی شکل و صورت سے نا آشنا تھا، پیرن نے برج موہن سے اس کی ملاقات تک نہ کرائی تھی۔ صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ کسی مل میں کام کرتا ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ ایک اتوار برج باندہرہ سے واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”لو بھی مننو آج معاملہ ختم ہو گیا۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ پیرن والا

”ہاں بھی کپڑے ختم ہو رہے تھے میں نے سوچا کہ یہ سلسلہ ختم کر دوں اب انشاء اللہ کچھ دنوں ہی میں کوئی نہ کوئی ملازمت مل جائے گی۔ میرا خیال ہے سیٹھ نیاز علی سے ملوں۔ اس نے اک فلم بنانے کا اعلان کیا ہے۔ کل ہی جاؤں گا۔ تم یا ذرا اس کے دفتر کا پتہ لگا لینا۔“

میں نے اس کے دفتر کا پتہ ایک دوست سے پوچھ کر برج موہن کو بتا دیا۔ وہ دوسرے روز وہاں گیا۔ شام کو لوٹا اس کے مطمئن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ”بھی مننو“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے ٹائپ شدہ کاغذ نکالا اور میری طرف پھینک دیا۔ ایک پکچر کا کنٹریکٹ تنخواہ دوسرو پے ماہوار۔ کم ہے، لیکن سیٹھ نیاز علی نے کہا ہے بڑھادوں گا۔ ٹھیک ہے!“

میں ہنسا ”اب پیرن سے کب ملو گے؟“

برج موہن مسکرایا۔ ”کب ملوں گا؟ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اس سے کب ملنا چاہئے۔ مننو یا میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک میری چھوٹی سی خواہش ہے، بس وہ پوری ہو جائے۔ میرا خیال ہے مجھے اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ ذرا میرے تین چار جوڑے بن جائیں۔ پچاس روپے ایڈوانس لے آیا ہوں۔ پچیس تم رکھ لو۔“

پچیس میں نے لے لیے۔ ہوٹل والے کا قرض تھا جو فوراً چکا دیا گیا۔ ہمارے دن بڑی خوشحالی میں گزرنے لگے۔ سو روپیہ ماہوار میں کما

لیتا تھا۔ دوسور پے ماہانہ برجموہن لے آتا تھا۔ بڑے عیش تھے۔ پانچ مہینے گزر گئے کہ اچانک ایک روز پیرن کا خط برج موہن کو وصول ہوا۔

”لو بھئی منٹو عزیز رائیل صاحب تشریف لے آئے۔“ صحیح بات ہے کہ میں نے اس وقت خط دیکھ کر خوف سا محسوس کیا۔ مگر برجموہن نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ خط کا کاغذ نکال کر پڑھا۔ بالکل مختصر تحریر تھی۔ میں نے برج سے پوچھا۔

”کیا فرماتی ہیں۔؟“

فرماتی ہیں، اتوار کو مجھ سے ضرور ملو۔ ایک اشد ضروری کام ہے۔ برجموہن نے خط لفافے میں واپس ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ جاؤ گے؟

جانا ہی پڑے گا۔ پھر اس نے یہ فلمی گیت گانا شروع کر دیا۔

”مت بھول مسافر تجھے جانا ہی پڑے گا“

میں نے اس سے کہا۔ برج مت جاؤ اس سے ملنے۔ بڑے اچھے دن گزر رہے ہیں ہمارے تم نہیں جانتے، میں خدا معلوم کس طرح تمہیں آٹھ آنے دیا کرتا تھا۔

برج موہن مسکرایا۔ مجھے سب معلوم ہے، لیکن افسوس ہے کہ اب وہ دن پھر آنے والے ہیں۔ جب تم خدا معلوم کس طرح مجھے ہر اتوار آٹھ آنے دیا کرو گے۔

اتوار کو برج پیرن سے ملنے باندہ گیا۔ واپس آیا تو اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا۔ یہ بارہویں مرتبہ ہے کہ مجھے تمہاری نحوست کی وجہ سے برطرف ہونا پڑے گا۔ تم پر رحم ہو زرتشت کی!

میں نے پوچھا۔ اس نے یہ سن کر کچھ کہا؟

برج نے جواب دیا۔ فقط یہ تم سلی ایڈیٹ ہو۔

تم ہو؟

سونی صدی! یہ کہہ کر برج ہنسا۔ اب میں کل صبح دفتر جاتے ہی استعفیٰ پیش کر دینے والا ہوں۔ میں نے وہیں پیرن کے ہاں لکھ لیا ہے۔

برج موہن نے مجھے استعفیٰ کا کاغذ دکھایا۔ دوسرے روز خلاف معمول اس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ شام کو لوٹا تو

اس کا چہرہ اتر ا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مجھے ہی بال آخر اس سے پوچھنا پڑا۔

”کیو برج کیا ہوا؟“

□

اس نے بڑی ناامیدی سے سر ہلایا۔ کچھ نہیں یار۔ سارا قصہ ہی ختم ہو گیا۔

کیا مطلب؟

میں نے سیٹھ نیاز علی کو اپنا استغنے پیش کیا تو اس نے مسکرا کر مجھے ایک آفیشل خط دیا۔ اس میں یہ لکھا تھا۔ کہ میری تنخواہ پہلے مہینے سے دو سو کے بجائے تین سو روپے ماہوار کر دی گئی ہے

پیرن سے برج موہن کی دلچسپی ختم ہو گئی اس نے مجھ سے ایک روز کہا۔

پیرن کی نحوست ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو گئی۔ اور میرا ایک نہایت دلچسپ مشغلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب کون جو مجھے بیکار رکھنے کا

موجب ہوگا!



□

خورشٹ

ہم دلی میں تھے۔ میرا بچہ بیمار تھا۔ میں نے پڑوس کے ڈاکٹر کا پڑیا کو بلا یا۔ وہ ایک کبڑا آدمی تھا۔ بہت پست قد لیکن بے حد شریف۔ اس نے میرے بچے کا بڑے اچھے طریقے پر علاج کیا۔ اس کو فیس دی تو اس نے قبول نہ کی۔ یوں تو وہ پارسی تھا لیکن بڑی شستہ و رفتہ اردو بولتا تھا اس لیے کہ وہ دلی ہی میں پیدا ہوا تھا اور تعلیم اس نے وہیں حاصل کی تھی۔

ہمارے سامنے کے فلیٹ میں مسٹر کھیش والا رہتا تھا۔ یہ بھی پارسی تھا۔ اسی کے ذریعے سے ہم نے ڈاکٹر کا پڑیا کو بلا یا تھا۔ تین چار مرتبہ ہمارے یہاں آیا تو اس سے ہمارے تعلقات بڑھ گئے۔ ڈاکٹر کے ہاں میرا اور میری بیوی کا آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ہماری ملاقات اپنے لڑکے سے کرائی۔ اس کا نام ساوک کا پڑیا تھا۔ وہ بہت ہی ملنسار آدمی تھا۔ رنگ بے حد زرد ایسا لگتا تھا کہ اس میں خون ہے ہی نہیں۔ سنگر مشین کمپنی میں ملازم تھا۔ غالباً پانچ چھ سو روپے ماہوار پاتا تھا۔ بہت صاف ستھرا رہتا تھا۔ اس کا گھر جو ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا، بہت نفاست سے سجا ہوا تھا۔ مجال ہے کہ گردوغبار کا ایک ذرہ بھی کہیں نظر آ جائے۔

جب میں اور میری بیوی شام کو ان کے ہاں جاتے تو وہ اور اس کی بیوی خورشید جس کو پارسیوں کی زبان میں خورشٹ کہا جاتا تھا بڑے تپاک سے پیش آتے اور ہماری خوب خاطر تواضع کرتے۔ خورشید یعنی خورشٹ لمبے قد کی عورت تھی۔ عام پارسیوں کی طرح اس کی ناک بد نما نہیں تھی، لیکن خوبصورت بھی نہیں تھی۔ موٹی پکوڑا ایسی ناک تھی لیکن رنگ سفید تھا اس لیے گوارا ہو گئی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ چہرہ گول تھا۔ خوش پوش تھی اس لیے اچھی لگتی تھی۔ میری بیوی سے چند ملاقاتوں میں ہی دوستی ہو گئی۔ چنانچہ ہم اکثر اس کے ہاں جانے لگے۔ وہ دونوں میاں بیوی بھی ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے ہاں آ جاتے تھے اور دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔

ہم جب بھی ساوک کے ہاں گئے، ایک سکھ کو ان کے ہاں دیکھا۔ یہ سکھ ایک تو مندا آدمی تھا۔ بہت خوش خلق۔ ساوک نے مجھے بتایا کہ سردار زور آور سنگھ اس کا بچپن کا دوست ہے۔ دونوں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ایک ساتھ انہوں نے بی اے پاس کیا لیکن شکل و صورت کے اعتبار سے سردار زور آور سنگھ ساوک کے مقابلے میں زیادہ معمر نظر آتا تھا۔ ساوک شاید خون کی کمی کے باعث بہت ہی چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں، لیکن سردار زور آور سنگھ چالیس کے اوپر معلوم ہوتا تھا۔

سردار زور آور سنگھ کنوارا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ اس نے گورنمنٹ سے کئی ٹھیکے لے رکھے تھے۔ اس کا باپ بہت پرانا گورنمنٹ

کنٹر یکنر تھا۔ لیکن باپ بیٹے میں بنتی نہیں تھی۔ سردار زور اور سنگھ آزاد خیال تھا لیکن وہ اپنے باپ ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ پروہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ البتہ اس کی ماں اس سے بہت پیار کرتی تھی جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ماں کا اکلوتا لڑکا تھا۔ تین لڑکیاں تھیں، وہ اپنے گھروں میں آباد ہو چکی تھیں۔ اب اس کی خواہش تھی کہ شادی کر لے اور اس کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچائے، مگر وہ اس کے متعلق بات کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

میں نے ایک دفعہ سردار سے دریافت کیا۔ ”سردار صاحب! آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟“

اس نے مونچھوں کے اندر ہنس کر جواب دیا۔ ”کروں گا اتنی جلدی کیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کی عمر کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میرے خیال کے مطابق آپ کی عمر غالباً چالیس برس ہوگی۔“

سردار زور اور سنگھ مسکرایا۔ ”آپ کا اندازہ غلط ہے۔“

”آپ فرمائیے، آپ کی عمر کیا ہے؟“

سردار زور اور سنگھ پھر مسکرایا۔ ”میں آپ سے بہت چھوٹا ہوں، عمر کے لحاظ سے بھی۔ میں ابھی پوسوں اسی اگست کو پچیس برس کا ہوا

ہوں۔“

میں نے اپنے غلط اندازے کی معافی چاہی۔ ”لیکن آپ کی شکل و صورت سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ

کی عمر پچیس برس ہے۔“

سردار زور اور سنگھ ہنسا۔ ”میں سکھ ہوں۔۔۔۔۔ اور بڑا غیر معمولی سکھ۔“ یہ کہہ کر اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”منٹو صاحب

آپ حجامت کیوں نہیں کراتے، اتنے بڑے بالوں سے آپ کو وحشت نہیں ہوتی؟“

میں نے گردن پر ہاتھ پھیرا۔ بال واقعی بہت بڑھے ہوئے تھے۔ غالباً تین مہینے ہو گئے تھے، جب میں نے بال کٹوائے تھے۔ سردار

زور اور سنگھ نے بات کی تو مجھے سر پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ ”یاد ہی نہیں رہا۔ اب آپ نے کہا ہے تو مجھے وحشت محسوس ہوئی ہے۔ خدا

معلوم مجھے کیوں بال کٹوانے یاد نہیں رہتے۔ یہ سلسلہ ہے ہی کچھ واہیات۔ ایک گھنٹہ نائی کے سامنے سر نیوڑھائے بیٹھے رہو۔ وہ اپنی

خرافات بکنا رہے اور آپ مجبوراً کان سمیٹتے سنتے رہیں۔ فلاں ایکٹرس ویسی ہے۔ امریکہ نے ایٹم بم ایجاد کر لیا ہے۔ روس کے پاس اس کا

بہت ہی ٹکڑا جواب ہے۔ یہ اٹھلی کون ہے۔ اور وہ موسولینی کہاں گیا۔۔۔۔۔ اب اگر میں اس سے کہوں کہ جہنم میں گیا تو وہ ضرور پوچھتا

ہے کہ صاحب کیسے گیا، کس راستے سے گیا، کون سے جہنم میں گیا۔“

21

میری اتنی لمبی چوڑی بات سن کر سردار زور آور سنگھ نے اپنی سفید پگڑی اتاری۔ مجھے سخت حیرت ہوئی اس لیے کہ اس کے کیس ندارد تھے۔ ان کے بجائے ہلکے خشکی بال تھے۔ لیکن وہ پگڑی کچھ اس انداز سے باندھتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کیس ہیں اور ثابت و سالم ہیں۔

بڑی صفائی سے پگڑی اتار کر اس نے میری تپائی پر رکھی اور مسکرا کر کہا۔ ”میں تو اس سے بڑے بال کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔“ میں نے اس کے بالوں کے متعلق کوئی بات نہ کی اس لیے کہ میں نے مناسب خیال نہ کیا۔ اس نے بھی ان کے متعلق صرف اتنا کہا تھا۔ ”میں تو اس سے بڑے بال کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس کے بعد اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور کہا۔ ”منٹو صاحب! خورشید کے لیے آپ کچھ کہجئے۔“

میں کچھ نہ سمجھا۔ ”کون خورشید؟“

سردار زور آور سنگھ نے پگڑی اٹھا کر اپنے سر پر رکھی۔ ”خورشید کا پڑیا کے لیے؟“

”میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”اس کوگانے کا بہت شوق ہے۔“

مجھے معلوم نہیں تھا کہ خورشید گاتی ہے۔ ”کیسا گاتی ہے؟“

سردار زور آور سنگھ نے خورشید کی گائیکی کے بارے میں اتنی تعریف کی کہ مجھے یہ سب مبالغہ معلوم ہوا۔ ”منٹو صاحب بہت اچھی آواز پائی ہے۔ خصوصاً ٹھمری ایسی اچھی گاتی ہے کہ آپ وجد میں آ جائیں گے۔ آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ خان صاحب عبدالکریم کو سن رہے ہیں۔ اور لطف یہ کہ خورشید نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ بس جو ملا ہے قدرت سے ملا ہے۔ آپ آج شام کو آئیے۔ مسز منٹو بھی ضرور تشریف لائیں۔ میں خورشید کو بلاؤں گا۔ آپ ذرا اسے سنئے گا۔“

میں نے کہا۔ ”ضرور ضرور۔۔۔۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ گاتی ہیں۔“

سردار زور آور سنگھ نے سفارش کے طور پر کہا۔ ”آپ ریڈیو اسٹیشن میں ہیں، میں چاہتا ہوں کہ خورشید کو ہر مہینے کچھ پروگرام مل جایا کریں۔ روپے کی اس کو خواہش نہیں ہے۔“

”لیکن اگر پروگرام ملے گا تو معاوضہ بھی ضرور ملے گا۔ گورنمنٹ ان کا معاوضہ کس کھاتے میں ڈالے گی؟“

یہ سن کر سردار زور آور سنگھ مسکرایا۔ ”تو ٹھیک ہے۔ لیکن اسے پروگرام ضرور دلوائیے گا۔۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ سننے والے اسے

بہت پسند کریں گے۔“

□

اس گفتگو کے بعد ہم تیسرے روز ساوک کے ہاں گئے۔ وہ موجود نہیں تھا، لیکن ڈرائنگ روم میں سردار زور اور سنگھ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ پارسیوں میں سگریٹ پینا منع ہے، سگھ بھی سگریٹ نہیں پیتے، لیکن وہ بڑے اطمینان اور ٹھاٹ سے کش پہ کش لے رہا تھا۔ میں اور میری بیوی کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے سگریٹ پینا بند کر دیا۔ ایش ٹرے میں اس کی گردن مروڑ کر اس نے ہمیں خالص اسلامی انداز میں سلام کیا اور کہا۔ ”خورشید کی طبیعت آج کچھ ناساز ہے۔“

خورشید کچھ دیر کے بعد آئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت قطعاً ناساز نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر کے کہا۔ ”ذرا زکام تھا۔“

مگر اس کو زکام نہیں تھا۔ سردار زور اور سنگھ نے بڑے زوردارانہ انداز میں خورشید سے اس کا حال پوچھا، زکام کے لیے کم از کم دس دو اچھے تجویز کیں، پانچ ڈاکٹروں کے حوالے دیئے، مگر وہ خاموش رہی جیسے وہ اس قسم کی بکو اس سننے کی عادی ہے۔ اتنے میں خورشید کا خاوند ساوک کا پڑیا آ گیا۔ دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے اسے دیر ہو گئی تھی۔ مجھ سے اور میری بیوی سے اس نے معذرت چاہی، سردار زور اور سنگھ سے کچھ دیر مذاق کیا اور ہم سے چند منٹ کی رخصت لے کر اندر چلا گیا۔ اس لیے کہ اسے اپنی بچی کو دیکھنا تھا۔

اس کی پلوٹھی کی بچی بہت پیاری تھی میاں بیوی کی بس یہی ایک اولاد تھی۔ تقریباً ڈیڑھ برس کی تھی۔ رنگ باپ کی طرح زرد۔۔۔۔۔ کچھ نقش ماں پر تھے، باقی معلوم نہیں کس کے تھے۔ بہت ہنس مکھ تھی۔ ساوک اس کو گود میں اٹھا کر لایا اور ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ اس کو اپنی بچی سے بے حد پیار تھا۔ دفتر سے واپس آ کر وہ سارا وقت اس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ میرا خیال ہے قریب قریب ہر ہفتے وہ اس کے لیے کھلونے لاتا تھا۔ شیشوں والی بڑی الماری تھی جو ان کھلونوں سے بھری ہوئی تھی۔

سردار زور اور سنگھ کے متعلق بات چھڑی تو ساوک نے اس کی بہت تعریف کی۔ اس نے مجھ سے اور میری بیوی سے کہا۔ ”سردار زور اور سنگھ میرا بہت پرانا دوست ہے۔ ہم دونوں لنگوٹے ہیں۔ دونوں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ پہلی جماعت سے لے کر اب تک ہم دونوں ہر روز ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں۔ بعض اوقات تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ہم اسکول ہی میں پڑھ رہے ہیں۔“

سردار زور اور سنگھ مسکراتا رہا۔ اس کے سر پر سکھوں کی بہت بڑی پگڑی تھی، مگر مجھے اس کے ہوتے ہوئے اس کے نشنشی بال نظر آ رہے تھے اور مجھے اپنے سر پر اپنے بالوں کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

سردار زور اور سنگھ کے پیہم اصرار پر خورشید نے باجا منگا کر ہمیں گانا سنایا۔ وہ کن سری تھی، لیکن خورشید اس کے خاوند اور سردار زور اور سنگھ کی خاطر مجھے اس کے گانے کی مجبوراً تعریف کرنا پڑی۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ”ماشاء اللہ آپ خوب گاتی ہیں۔“

سردار زور آور سنگھ نے بڑے زور سے تالی بجائی اور کہا۔ ”خورشید! آج تو تم نے کمال کر دیا ہے۔“ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اس کو آفتاب موسیقی کا خطاب مل چکا ہے منٹو صاحب!“

میں نے تو کچھ نہ کہا، لیکن میری بیوی نے پوچھا۔ ”کب؟“

سردار زور آور سنگھ نے کہا۔ ”اخبار کا وہ کٹنگ لانا۔“

خورشید اخبار کی کٹنگ لائی۔ کوئی خوشامدی قسم کا رپورٹ تھا، جس نے چھ مہینے پہلے ایک پرائیویٹ محفل میں خورشید کا گانا سن کر اسے آفتاب موسیقی کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ میں یہ کٹنگ پڑھ کر مسکرایا اور شرارتا خورشید سے کہا۔ ”آپ کا یہ خطاب غلط ہے۔“

سردار زور آور سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیوں؟“

میں نے پھر شرارتا کہا۔ ”عورت کے لیے آفتاب نہیں۔۔۔۔۔۔ آفتاب ہونا چاہیے خورشید صاحبہ آفتاب موسیقی نہیں آفتاب موسیقی ہیں۔“

میرا مذاق سب کے سر پر سے گزر گیا۔ میں نے خدا کا شکر کیا کیوں کہ یہ مذاق کرنے کے بعد میں نے فوراً ہی سوچا تھا کہ اور کوئی نہیں سردار زور آور سنگھ ضرور اس کو سمجھ جائے گا۔ مگر وہ مسکرایا۔ ”یہ اخبار والے ہمیشہ غلط زبان لکھتے ہیں۔ آفتاب کی جگہ آفتاب ہونا چاہیے تھا۔ آپ بلکہ صحیح فرماتے ہیں۔“

میں نے اور کچھ نہ کہا، اس لیے کہ مجھے احساس تھا کہ کہیں میرا مذاق فاش نہ ہو جائے۔ ساوک کچھ اور ہی خیالات میں غرق تھا۔ اس کو سردار زور آور سنگھ کی دوستی کے واقعات یاد آرہے تھے۔ ”مسٹر منٹو! ایسا دوست مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ اس نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ ہمیشہ میرے ساتھ انتہائی خلوص برتا ہے۔ پچھلے دنوں میں ہسپتال میں بیمار تھا۔ اس نے نرسوں سے بڑھ کر میری خدمت کی۔ میرے گھر بار کا خیال رکھا۔ خورشید اکیلی گھبرا جاتی، مگر اس نے ہر طرح دلجوئی کی۔ میری بیٹی کو گھنٹوں کھلاتا رہا۔ اس کے علاوہ میرے پاس بیٹھ کر کئی اخبار پڑھ کر سنا تا رہا۔ میں اس کا شکر یہ ادا نہیں کر سکتا۔“

یہ سن کر سردار زور آور سنگھ مسکرایا اور خورشید سے مخاطب ہوا۔ ”آج تمہارا خاوند بہت سنی مینٹل ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے کیا کیا تھا جو میری تعریف کر رہا ہے۔“

ساوک نے کہا۔ ”جو اس نہ کرو۔ تمہاری تعریف میں کر ہی نہیں سکتا۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری دوستی پر مجھے ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بچپن سے لے کر اب تک تم ایک سے رہے ہو۔ میرے ساتھ تمہارے سلوک میں کبھی فرق نہیں آیا۔“

میں نے سردار زور آور سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ یہ تعریفی کلمات یوں سن رہا تھا جیسے ریڈیو سے خبریں۔ جب ساوک بول چکا تو اس نے

21

مجھ سے پوچھا۔ ”تو خورشید کو پروگرام مل جائیں گے نا؟“

میں نے چونک کر جواب دیا۔ ”جی۔۔۔۔۔ میں کوشش کروں گا۔“

سردار زور آور سنگھ نے ذرا حیرت سے کہا۔ ”کوشش۔۔۔۔۔ یعنی ان کے لیے پروگرام حاصل کرنے کے لیے آپ کی کوشش کرنی پڑے گی۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔۔۔۔۔ کل صبح ان کو اپنے ساتھ لے جائیے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا گانا سنتے ہی میوزک ڈائریکٹر اسی مینیجمنٹ میں ان کو کم از کم دو پروگرام دے دے گا۔“

میں نے اس کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی اور کہا۔ ”یقیناً!“

لیکن خورشید نے سردار زور آور سنگھ سے کہا۔ ”میں صبح نہیں جاسکتی۔ بے بی صبح کو میرے بغیر گھر میں نہیں رہ سکتی۔ دوپہر کو البتہ جاسکتی ہوں۔“

سردار زور آور سنگھ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”منٹو صاحب! واقعی بچی اس کو صبح بہت تنگ کرتی ہے، میں کسی روز خورشید کو دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن لے آؤں گا۔“

خورشید کو دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن لانے کی نوبت نہ آئی کیونکہ میں نے دوسرے روز ہی ایک دم ارادہ کر لیا کہ میں دلی چھوڑ کر بمبئی چلا جاؤں گا، چنانچہ میں اس سے اگلے دن استعفیٰ دے کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ میری بیوی مجھ سے کچھ دن بعد چلی آئی۔ ہم مسز خورشید کا پڑیا اور سردار زور آور سنگھ کو بھول گئے۔

میں ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا۔ بیماری کے باعث اتفاق سے ایک روز میں وہاں نہ گیا۔ دوسرے روز وہاں پہنچا تو گیٹ کیپر نے مجھے ایک کاغذ دیا کہ کل ایک صاحب آپ سے ملنے آئے تھے۔ وہ یہ دے گئے ہیں۔ میں نے رقم پڑھا۔ سردار زور آور سنگھ کا تھا۔ مختصر سی تحریر تھی۔ ”میں اور میری بیوی آپ سے ملنے یہاں آئے مگر آپ موجود نہیں تھے۔ ہم تاج ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ اگر آپ تشریف لائیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔ مسز منٹو کو ضرور ساتھ لائیے گا۔“

کمرے کا نمبر وغیرہ درج تھا۔ میں اور میری بیوی اسی شام ٹیکسی میں تاج ہوٹل گئے۔ کمرہ تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ سردار زور آور سنگھ وہاں موجود تھا۔ ہم جب اندر کمرے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے چھوٹے چھوٹے خوشنسی بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ میری بیوی اس کی بیوی کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی۔ چنانچہ اس نے پوچھا۔ ”سردار صاحب! آپ کی مسز کہاں ہیں؟“

سردار زور آور سنگھ مسکرایا۔ ”باتھ روم میں۔“

اس نے یہ کہا اور دوسرے کمرے سے خورشید نمودار ہوئی۔ میری بیوی اٹھ کر اس سے گلے ملی اور سب سے پہلا سوال اس سے یہ کیا۔

21

”پتی کیسی ہے خورشید؟“

خورشٹ نے جواب دیا۔ ”اچھی ہے۔“

پھر میری بیوی نے اس سے پوچھا۔ ”ساوک کہاں ہیں؟“

خورشٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ اور میری بیوی پاس بیٹھ گئیں تو میں نے سردار زور آور سنگھ سے پوچھا۔ ”سردار صاحب! آپ

اپنی بیوی کو تو باہر نکالیے۔“

سردار زور آور سنگھ مسکرایا۔ ”خورشٹ کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔“ خورشید میری بیوی کو باہر نکالو۔“

خورشٹ میری بیوی سے مخاطب ہو کر مسکرائی۔ ”میں نے سردار زور آور سنگھ سے شادی کر لی ہے۔ ہم یہاں ہنی مون منانے آئے

ہیں۔“

میری بیوی نے یہ سنا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہے۔ اٹھی اور میری ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”چلئے سعادت صاحب!“

اور ہم کمرے سے باہر تھے۔ خدا معلوم سردار زور آور سنگھ اور خورشٹ نے ہماری اس بدتمیزی کے متعلق کیا کہا ہوگا!



21

باسط

باسط بالکل رضامند نہیں تھا، لیکن ماں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ اول تو اس کو اتنی جلدی شادی کرنے کی خواہش نہیں تھی، اس کے علاوہ لڑکی بھی اسے پسند نہیں تھی، جس سے اس کی ماں اس کی شادی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر تک ٹالتا رہا۔ جتنے بہانے بنا سکتا تھا، اس نے بنائے، لیکن آخر ایک روز اس کو ماں کی اہل خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ دراصل انکار کرتے کرتے وہ بھی تنگ آ گیا تھا۔ چنانچہ اس نے دل میں سوچا۔ ”یہ بک بک ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے، ہونے دو شادی۔ کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نبھالوں گا۔“

اس کی ماں بہت خوش ہوئی۔ لڑکی والی اس کے عزیز تھے اور وہ عرصہ ہوا ان کو زبان دے چکی تھی۔ جب باسط نے ہاں کی تو وہ تاریخ پکی کرنے کے لیے لڑکی والوں کے ہاں گئی۔ انہوں نے ٹال مٹول کی تو باسط کی ماں کو بہت غصہ آیا۔

”سعیدہ کی ماں میں نے اتنی مشکلوں سے باسط کو رضامند کیا ہے، اب تم تاریخ پکی نہیں کر رہی ہو، شادی ہوئی تو اسی مہینے کی بیس کی ہوگی، نہیں تو نہیں ہوگی۔ اور یہ بات سولہ آنے پکی ہے۔ سمجھ لیا!“

دھمکی نے کام کیا۔ لڑکی کی ماں بال آخر راضی ہو گئی۔ سب تیار یاں مکمل ہوئیں۔ بیس کو دلہن گھر میں تھی۔ باسط کو وہ پسند نہیں تھی، لیکن وہ اس کے ساتھ نبھانے کا فیصلہ کر چکا تھا، چنانچہ وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آیا۔ اس پر بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، اور یہ کہ وہ زبردستی اس کے سر منڈھ دی گئی ہے۔

نئی دلہنیں عام طور پر بہت شرمیلی ہوتی ہیں۔ لیکن باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ ضرورت سے زیادہ شرمیلی ہے۔ اس کے اس شرمیلے پن میں کچھ خوف بھی تھا، لیکن جیسے وہ باسط سے ڈرتی ہے۔ شروع شروع میں باسط نے سوچا کہ یہ چیز دور ہو جائے گی، مگر وہ بڑھتی ہی گئی۔ باسط نے اس کو چند روز کے لیے میکے بھیج دیا۔ واپس آئی تو اس کا خوف آلود شرمیلا پن ایک حد تک دور ہو چکا تھا۔ باسط نے سوچا، ایک دو مرتبہ اور میکے جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی، مگر اس کا یہ قیاس غلط نکلا۔ سعیدہ پھر خوفزدہ رہنے لگی۔

باسط نے ایک روز اس سے پوچھا۔ ”سعیدہ تم ڈری ڈری کیوں رہتی ہو؟“

سعیدہ یہ سن کر چونکی۔ ”نہیں تو۔۔۔۔۔۔۔۔ نہیں تو“

باسط نے انکار کر دیا۔ ”وہاں طبیعت ٹھیک ہو سکتی ہے تو یہاں بھی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ جاؤ آرام سے لیٹ جاؤ۔“

باسط کی ماں آگئی۔ باسط نے اس سے کہا۔ ”امی جان! دیکھئے سعیدہ ضد کر رہی ہے طبیعت اس کی ٹھیک نہیں کہتی ہے مجھے امی جان کے پاس لے چلو۔“

باسط کی ماں نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ ”کل چلی جانا سعیدہ!“

سعیدہ نے اور کچھ نہ کہا۔ خاموش ہو کر باہر صحن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد باسط باہر نکلا۔ سعیدہ صحن میں نہیں تھی۔ اس نے ادھر

ادھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملی۔ باسط نے سوچا، اوپر کوٹھے پر ہوگی۔ اوپر گیا تو غسل خانے کا دروازہ بند تھا، کھٹکھٹا کر اس نے آواز دی۔ ”سعیدہ!“

کوئی جواب نہ ملا تو پھر پکارا۔ ”سعیدہ!“

اندر سے بڑی نحیف آواز آئی۔ ”جی!“

باسط نے پوچھا۔ ”کیا کر رہی ہو؟“

اور زیادہ نحیف آواز آئی۔ ”نہا رہی ہوں۔“

باسط نیچے آ گیا۔ سعیدہ کے بارے میں سوچتا باہر گلی میں نکلا۔ موری کی طرف نظر پڑی تو اس میں خون ہی خون تھا اور یہ خون غسل خانے

سے آ رہا تھا جس میں سعیدہ نہا رہی تھی۔ باسط کے ذہن میں اوپر تلے کئی خیالات اوندھے سیدھے گرے پھر یہ گردان شروع ہو گئی۔

”دوا۔۔۔۔۔ خون۔۔۔۔۔ خون۔۔۔۔۔ خون۔۔۔۔۔ دوا۔۔۔۔۔ ڈر۔۔۔۔۔ دوا۔۔۔۔۔“

خون۔۔۔۔۔ ڈر!“

پھر اس نے آہستہ آہستہ سوچنا شروع کیا۔ سعیدہ کی ماں شادی کی تاریخ کچی نہیں کرتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ایک دو مہینے ٹھہر جاؤ۔

سعیدہ کا بار بار اپنی ماں سے ملنے جانا۔ اس کا ہر وقت خوفزدہ رہنا، دوا کھانا۔۔۔۔۔ اور خاص طور پر آج بہت ہی زیادہ وحشت زدہ

رہنا۔

باسط سارا معاملہ سمجھ گیا۔ سعیدہ پیٹ سے تھی۔ جب وہ دلہن بن کر اس کے پاس آئی تھی، تو اس کی ماں کی یہ کوشش تھی کہ حمل گر جائے۔

چنانچہ آج وہ چیز ہوئی۔ باسط نے سوچا۔ ”کیا میں اوپر جاؤں۔۔۔۔۔ جا کر سعیدہ کو دیکھوں۔۔۔۔۔ اپنی ماں سے بات

کروں؟“

ماں کا سوچا تو اس کو خیال آیا کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں ذلیل ہونا کبھی گوارا نہیں کرے گی۔

ضرور کچھ کھا کر مر جائے گی۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اپنے کمرے میں گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کئی بار اس کو سعیدہ کا خیال آیا کہ وہ خدا معلوم کس حالت میں ہوگی۔ اس کے جسم پر اس کے دل و دماغ پر کیا کچھ بیٹا ہوگا اور کیا بیت رہا ہوگا۔ کیسے اتنا بڑا راز چھپائے گی۔ کیا لوگ پہچان نہیں جائیں گے۔ جوں جوں وہ سعیدہ کے بارے میں سوچتا اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بڑھتا جاتا۔ اس کو سعیدہ پر ترس آنے لگا۔ ”بے چاری معلوم نہیں بے ہوش پڑی ہے یا ہوش میں ہے۔ ہوش میں بھی اس پر جانے کیا گزر رہی ہوگی۔ کیا وہ نیچے آسکے گی؟“

تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھ کر صحن میں گیا تو سعیدہ نیچے آگئی۔ اس کا رنگ بے حد زرد تھا، اتنا زرد کہ وہ بالکل مردہ معلوم ہوتی تھی۔ اس سے بمشکل چلا جاتا تھا۔ ٹانگیں لڑکھڑاہی تھیں۔ کمر میں جیسے جان نہیں تھی۔ باسط نے اس کو دیکھا تو اس پر بہت ترس آیا۔ اندر سے برقع اٹھایا اور اس سے کہا۔ ”چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“

سعیدہ نے بہت ہمت سے کام لیا۔ باسط کے ساتھ چل کر باہر سڑک تک گئی۔ باسط نے تا نگہ لیا اور اس کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آیا۔ ماں نے اس سے پوچھا۔ ”سعیدہ کہاں ہے؟“

باسط نے جواب دیا۔ ”ضد کرتی تھی میں اسے چھوڑ آیا ہوں۔“

باسط کی ماں نے اس کو ڈانٹا۔ ”بکو اس کرتے ہو، ضد کرنے دی ہوتی۔ تم اس طرح اس کی عادتیں خراب کرو گے اور پھر مجھ سے کہو گے کہ میں نے غلط جگہ تمہارا رشتہ کیا تھا۔“

باسط نے کہا۔ ”نہیں امی جان، سعیدہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

اس کی ماں مسکرائی۔ ”میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ وہ بہت نیک لڑکی ہے، تم اسے ضرور پسند کرو گے۔“ پھر تھوڑی دیر چھا لیا کائٹنے کے بعد ایک دم باسط سے مخاطب ہوئی۔ ”اور ہاں باسط یہ اوپر غسل خانے میں خون کیسا ہے؟“

باسط شپٹا سا گیا۔ ”وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کچھ نہیں امی جان، میری نکسیر پھوٹی تھی۔“

ماں نے بڑے غصے سے کہا۔ ”کم بخت! گرم چیزیں نہ کھایا کرو۔ جب دیکھو، جیسیں مونگ پھلی سے بھری ہیں۔“

باسط کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہ اٹھ کر کہیں گئی تو باسط اوپر غسل خانے میں گیا، پانی ڈال کر اچھی طرح صاف کیا۔ اس کے دل کو اس بات کا بڑا اطمینان تھا کہ اس نے اپنی ماں سے سعیدہ کے متعلق کوئی بات نہیں کی، اور نہ اس نے سعیدہ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس کا راز جانتا ہے۔

وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ سعیدہ کا راز ہمیشہ اس کے سینے میں دفن رہے گا۔ وہ کافی تکلیف اٹھا چکی تھی۔ باسط کے خیال کے مطابق اس کو اپنے کئے کی سزا مل چکی تھی۔ مزید سزا دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ”خدا کرے وہ جلد تندرست ہو جائے۔ اب اس کے چہرے پر وہ

الجھن پیدا کرنے والا خوف نہیں رہے گا۔“ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے سے اس کی ماں کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ باسط لوٹا رکھ کر دوڑا نیچے گیا۔ سب کمرے دیکھے۔ ڈیوڑھی میں گیا تو اس کی ماں فرش پر اوندھی پڑی تھی، مردہ۔ اس کے سامنے کوڑے والے لکڑی کے بکس میں ایک چھوٹا سا مکمل بچہ کپڑے میں لپٹا پڑا تھا۔

باسط کو بے حد صدمہ ہوا۔ اس نے پہلے اس بچے کو اٹھایا۔ کپڑے میں اچھی طرح لپیٹا اور اندر جا کر بوٹ کے خلاف ڈبے میں بند کر دیا۔ پھر ماں کو اندر چار پائی پر لٹایا اور اس کے سر ہانے بیٹھ کر دیر تک روتا رہا۔

سعیدہ کو اطلاع پہنچی تو اس کو ماں کے ساتھ آنا پڑا۔ وہ اسی طرح زرد تھی۔ پہلے سے زیادہ نڈھال۔ باسط کو بہت ترس آیا۔ اس سے کہا۔ ”سعیدہ! جو اللہ کو منظور تھا، ہو گیا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ رونا بند کرو اور اندر جا کر لیٹ جاؤ۔“

اندر جانے کی بجائے سعیدہ ڈیوڑھی میں گئی۔ جب واپس آئی تو اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ باسط خاموش رہا۔ سعیدہ نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ آنسو صاف بتا رہے تھے کہ وہ باسط کا شکر یہ ادا کر رہی ہے۔ باسط نے اس سے بڑے پیار سے کہا۔ ”زیادہ رونا اچھا نہیں سعیدہ! جو خدا کو منظور تھا، ہو گیا۔“

دوسرے روز اس نے بچے کو نہر کے کنارے گڑھا کھود کر دفن دیا۔



21

شاردا

نذیر بلیک مارکیٹ سے وہسکی کی بوتل لانے گیا۔ بڑے ڈاک خانے سے کچھ آگے بندرگاہ کے پھانک سے کچھ ادھر سگریٹ والے کی دکان سے اس کو اسکاچ مناسب داموں پر مل جاتی تھی جب اس نے پینتیس روپے ادا کر کے کاغذ میں لپیٹی ہوئی بوتل لی تو اس وقت گیارہ بجے تھے دن کے۔ یوں تو وہ رات کو پینے کا عادی تھا مگر اس روز موسم خوشگوار ہونے کے باعث وہ چاہتا تھا کہ صبح ہی سے شروع کر دے اور رات تک پیتا رہے۔

بوتل ہاتھ میں پکڑے وہ خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ یوری بندر کے اسٹینڈ سے ٹیکسی لے گا۔ ایک پیگ اس میں بیٹھ کر پیئے گا اور ہلکے ہلکے سرور میں گھر پہنچ جائے گا۔ بیوی منع کرے گی تو وہ اس سے کہے گا۔ ”موسم دیکھ کتنا اچھا ہے۔“ پھر وہ اسے وہ بھونڈا سا شعر سنائے گا۔

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج

وہ کچھ دیر ضرور چیخ کرے گی، لیکن بالآخر خاموش ہو جائے گی اور اس کے کہنے پر قیام کے پراٹھے بنانا شروع کر دے گی۔ دکان سے وہ بیس پچیس گزر رہا ہوا کہ ایک آدمی نے اس کو سلام کیا۔ نذیر کا حافظہ کمزور تھا۔ اس نے سلام کرنے والے آدمی کو نہ پہچانا، لیکن اس پر ظاہر نہ کیا کہ وہ اس کو نہیں جانتا، چنانچہ بڑے اخلاق سے کہا۔ ”کیوں بھئی کہاں ہوتے ہو؟ کبھی نظر ہی نہیں آئے؟“ اس آدمی نے مسکرا کر کہا۔ ”حضور! میں تو یہیں رہتا ہوں۔ آپ ہی کبھی تشریف نہیں لائے۔“ نذیر نے اس کو پھر بھی نہ پہچانا۔ ”میں اب جو تشریف لے آیا ہوں۔“

”تو چلے میرے ساتھ!“

نذیر اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ ”چلو“

اس آدمی نے نذیر کے ہاتھ میں بوتل دیکھی اور معنی خیز طریقے پر مسکرایا۔ ”باقی سامان تو آپ کے پاس موجود ہے۔“ یہ فقرہ سن کر نذیر نے فوراً ہی سوچا کہ وہ دلال ہے۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

21

”پینتیس روپے میں۔“

”کون سا برانڈ ہے؟“

”جوئی واکر“

کریم نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”میں آپ کو تیس میں لا دوں گا۔“

نذیر نے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور کریم کے ہاتھ میں دے دیئے۔ ”نیکی اور پوچھ پوچھ۔۔۔۔۔۔ یہ لو۔ مجھے وہاں بٹھا کر تم

پہلا کام بھی کرنا۔ تم جانتے ہو میں ایسے معاملوں میں اکیلا نہیں پیا کرتا۔“

کریم مسکرایا۔ ”اور آپ کو یاد ہو گا میں ڈیڑھ پیگ سے زیادہ نہیں پیا کرتا۔“

نذیر کو یاد آ گیا کہ کریم واقعی آج سے چھ برس پہلے صرف ڈیڑھ پیگ لیا کرتا تھا۔ یہ یاد کر کے نذیر بھی مسکرایا۔ ”آج دور ہیں۔“

”جی نہیں ڈیڑھ سے زیادہ ایک قطرہ بھی نہیں۔“

کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس ٹھہر گیا۔ جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے میلے بورڈ پر میرینا ہوٹل لکھا تھا۔ نام تو

خوبصورت تھا مگر عمارت نہایت ہی غلیظ تھی۔ میڑھیاں شکستہ۔ نیچے سو دن خور پشمان بڑی بڑی شلواریں پہنے کھانوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ پہلی

منزل پر کرچھین آباد تھے۔ دوسری منزل پر جہاز کے بے شمار خلاصی۔ تیسری منزل ہوٹل کے مالک کے پاس تھے۔ چوتھی منزل پر کونے کا

ایک کمرہ کریم کے پاس تھا جس میں کئی لڑکیاں مرغیوں کی طرح ایک ڈربے میں بیٹھی تھیں۔ کریم نے ہوٹل کے مالک سے چابی منگوائی۔

ایک بڑا لیکن بے ہنگم سا کمرہ کھولا جس میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور تپائی پڑی تھی۔ تین اطراف سے یہ کمرہ کھلا تھا یعنی بے شمار

کھڑکیاں تھیں۔ جن کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اور کچھ نہیں لیکن ہوا کی بہت افراط تھی۔

کریم نے آرام کرسی جو بے حد میلی تھی ایک اس سے زیادہ میلے کپڑے سے صاف کی اور نذیر سے کہا۔ ”تشریف رکھئے۔ لیکن میں یہ

عرض کر دوں اس کمرے کا کرایہ دس روپے ہو گا۔“

نذیر نے کمرے کو اب ذرا غور سے دیکھا۔ ”دس روپے زیادہ ہیں یا۔“

کریم نے کہا۔ ”بہت زیادہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے۔ سالہا ہوٹل کا مالک ہی بنیا ہے۔ ایک پیسہ کم نہیں کرتا۔ اور نذیر صاحب موج شوق

کرنے والے آدمی بھی زیادہ کی پرواہ نہیں کرتے۔“

نذیر نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔۔ کرایہ پیشگی دے دوں؟“

”جی نہیں۔۔۔۔۔۔ آپ پہلے چھو کری تو دیکھئے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے ڈربے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی شرمیلی لڑکی تھی۔ گھریلو قسم کی ہندو لڑکی سفید دھوتی پہن رہی تھی۔ عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ خوش شکل تو نہیں تھی، لیکن بھولی بھالی تھی۔

کریم نے اس سے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔ یہ صاحب میرے دوست ہیں۔ بالکل اپنے آدمی ہیں۔“

لڑکی نظریں نیچی کئے لوہے کی چار پائی پر بیٹھ گئی۔ کریم یہ کہہ کر چلا گیا۔ ”اپنا اطمینان کر لیجئے نذیر صاحب، میں گلاس اور سوڈا لاتا ہوں۔“

نذیر آرام کرسی پر سے اٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سٹ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ نذیر نے اس سے چھ برس پہلے کے انداز میں پوچھا۔ ”آپ کا نام؟“

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر نے آگے سرک کر اس کے ہاتھ پکڑے اور پھر پوچھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے جناب؟“

لڑکی نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ ”شکنتلا“

اور نذیر کو شکنتلا یاد آگئی جس پر راجہ دھنیت عاشق ہوا تھا۔ ”میرا نام دھنیت ہے۔“

نذیر مکمل عیاشی پر تھلا ہوا تھا۔ لڑکی نے اس کی بات سنی اور مسکرا دی۔ اتنے میں کریم آ گیا۔ اس نے نذیر کو سوڈے کی چار بوتلیں دکھائیں جو ٹھنڈی ہونے کے باعث پسینہ چھوڑ رہی تھیں۔ ”مجھے یاد ہے کہ آپ کو روجر کا سوڈا پسند ہے۔ برف میں لگا ہوا لے کر آیا ہوں۔“

نذیر بہت خوش ہوا۔ ”تم کمال کرتے ہو۔“ پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ ”جناب آپ بھی شوق فرمائیں گی؟“

لڑکی نے کچھ نہ کہا، کریم نے جواب دیا۔ ”نذیر صاحب! یہ نہیں پیتی۔ آٹھ دن تو ہوئے ہیں اس کو یہاں آئے ہوئے۔“

یہ سن کر نذیر کو افسوس سا ہوا۔ ”یہ تو بہت بری بات ہے۔“

کریم نے دہسکی کی بوتل کھول کر نذیر کے لیے ایک پیگ بنایا اور اس کو آنکھ مار کر کہا۔ ”آپ راضی کر لیجئے اسے۔“

نذیر نے ایک ہی جرے میں گلاس ختم کیا۔ کریم نے آدھا پیگ لیا۔ فوراً ہی اس کی آواز نشہ آلود ہو گئی۔ ذرا جھوم کر اس نے نذیر سے پوچھا۔ ”چھو کری پسند ہے نا آپ کو؟“

نذیر نے سوچا کہ لڑکی اسے پسند ہے کہ نہیں، لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے شکنتلا کی طرف غور سے دیکھا۔ اگر اس کا نام شکنتلا نہ ہوتا تو بہت ممکن ہے وہ اسے پسند کر لیتا۔ وہ شکنتلا جس پر راجہ دھنیت شکار کھیلتے کھیلتے عاشق ہوا تھا، بہت ہی خوبصورت تھی۔ کم از کم کتابوں میں تو یہی درج تھا کہ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی، آہو چشم تھی۔ نذیر نے ایک بار پھر اپنی شکنتلا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بری نہیں تھیں۔ آہو چشم تو نہیں تھیں، لیکن اس کی آنکھیں اس کی اپنی آنکھیں تھیں۔ کالی کالی اور بڑی بڑی۔ اس نے اور کچھ نہ سوچا اور کریم

□

سے پوچھا۔ ”ٹھیک ہے یار۔۔۔۔۔۔ بولو معاملہ کہاں طے ہوتا ہے؟“

کریم نے آدھ پیگ اپنے لیے انڈیلا اور کہا۔ ”سورو پے!“

نذیر نے سوچنا بند کر دیا تھا۔ ”ٹھیک ہے!“

کریم اپنا دوسرا آدھا پیگ پی کر چلا گیا۔ نذیر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ شکنتلا کے پاس بیٹھا تو وہ گھبرا سی گئی۔ نذیر نے اس کا پیار لینا چاہا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نذیر کو اس کو یہ حرکت ناگوار محسوس ہوئی لیکن اس نے پھر کوشش کی۔ بازو سے پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھایا۔ زبردستی اس کو چوما۔ بہت ہی بے کیف سلسلہ تھا، البتہ وہ سکی کا نشہ اچھا تھا۔ وہ اب تک چھ پیگ پی چکا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی مہنگی چیز بالکل بے کار گئی ہے، اس لیے کہ شکنتلا بالکل الہرقھی۔ اس کو ایسے معاملوں کے آداب کی کوئی واقفیت ہی نہیں تھی۔ نذیر ایک اناڑی تیراک کے ساتھ ادھر ادھر بے کار ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ آخر اکتا گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے کریم کو آواز دی جو اپنے ڈر بے میں مرغیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آواز سن کر دوڑا آیا۔ ”کیا بات ہے نذیر صاحب؟“

نذیر نے بڑی ناامیدی سے کہا۔ ”کچھ نہیں یار یہ اپنے کام کی نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”کچھ سمجھتی ہی نہیں۔“

کریم نے شکنتلا کو الگ لے جا کر بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ سمجھ سکی۔ شرمائی، لجائی، دھوتی سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کریم نے اس پر کہا۔ ”میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“

نذیر نے اس کو روکا۔ ”جانے دو۔۔۔۔۔۔ کوئی اور لے آؤ۔“ لیکن اس نے فوراً ہی ارادہ بدل دیا۔ ”وہ جو تمہیں روپے دیئے تھے“

اس کی بوتل لے آؤ اور شکنتلا کے سوا جتنی لڑکیاں اس وقت موجود ہیں، انہیں یہاں بھیج دو۔ میرا مطلب ہے جو پیتی ہیں۔ آج اور کوئی سلسلہ نہیں ہوگا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں گا اور بس!“

کریم نذیر کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے چار لڑکیاں کمرے میں بھیج دیں نذیر نے ان سب کو سرسری نظر سے دیکھا کیونکہ وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ پروگرام صرف پینے کا ہوگا۔ چنانچہ اس نے ان لڑکیوں کے لیے گلاس منگوائے اور ان کے ساتھ پینا شروع کر دی۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوا کر کھایا اور شام کے چھ بجے تک ان لڑکیوں سے باتیں کرتا رہا۔ بڑی فضول قسم کی باتیں، لیکن نذیر خوش تھا۔ جو کوفت شکنتلا نے پیدا کی تھی، دور ہو گئی تھی۔

آدھی بوتل باقی تھی، وہ ساتھ لے کر گھر چلا گیا۔ پندرہ روز کے بعد پھر موسم کی وجہ سے اس کا جی چاہا کہ سارا دن پی جائے۔ سگریٹ

نذیر کی زندگی میں ایسا معاملہ کبھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے لڑکی سے بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔ ”شکنتلا کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی میرے کام کی نہیں بہت الہڑ ہے۔ مجھے ایسی لڑکیاں بالکل پسند نہیں۔ آپ شاید برامانیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ان عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں جو مرد کی ضروریات کو سمجھتی ہوں۔“

اس نے کچھ نہ کہا۔

نذیر نے اس سے دریافت کیا۔ ”آپ کا نام؟“

شکنتلا کی بڑی بہن نے مختصراً کہا۔ ”شاردا“

نذیر نے پھر اس سے پوچھا۔ ”آپ کا وطن؟“

”جے پور“ اس کا لہجہ بہت ٹیکھا اور خفگی آلود تھا۔

نذیر نے مسکرا کر اس سے کہا۔ ”دیکھئے، آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو آپ اسے سزا دے سکتی ہیں، لیکن میرا کوئی قصور نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نذیر اس سے مخاطب ہوا۔ ”یہ قصور میرا ہے، اس کی سزا میں جھگنتے کے لیے تیار ہوں۔“

لڑکی کے ماتھے پر بے شمار تہیلیاں نمودار ہوئیں۔ اس نے تین چار مرتبہ زمین پر تھوکا۔ غالباً گالیاں دینے والی تھی، لیکن چپ ہو گئی۔ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن فوراً ہی بیٹھ گئی۔ نذیر نے چاہا کہ وہ کچھ کہے۔ ”بتائیے، آپ مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہیں؟“

وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ڈر بے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ لڑکی اٹھی۔ نذیر نے اسے روکا۔ ”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

وہ ایک دم ماں بن گئی۔ ”منی رورہی ہے، دودھ کے لیے۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

نذیر نے اس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ نہ سوچ سکا۔ اتنے میں کریم و ہسکی کی بوتل اور سوڈے لے کر آ گیا۔ اس نے نذیر کے لیے سوڈا ڈالا۔ اپنا گلاس ختم کیا اور نذیر سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ ”کچھ باتیں ہوئیں شاردا سے؟ میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے پٹالیا ہوگا۔“

نذیر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بڑی غصیلی عورت ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔۔ صبح آئی ہے، میری جان کھا گئی ہے۔ آپ ذرا اس کو رام کریں۔ شکنتلا کو دیہاں آئی تھی، اس لیے کہ اس کا باپ

اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے۔ اور اس شاردہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا پتی شادی کے فوراً بعد ہی اس کو چھوڑ کر خدا معلوم کہاں چلا گیا ہے۔ اب اکیلی اپنی بچی کے ساتھ ماں کے پاس رہتی ہے۔ آپ منالیجے نا اس کو۔“

نذیر نے اس سے کہا۔ ”منانے کی کیا بات ہے!“

کریم نے اس کو آنکھ ماری۔ ”سالی مجھ سے تو مانتی نہیں؛ جب سے آئی ہے ڈانٹ رہی ہے۔“

اتنے میں شاردہ اپنی ایک سال کی بچی کو گود میں اٹھائے اندر کمرے میں آئی۔ کریم کو غصے سے دیکھا۔ اس نے آدھا پیگ پیا اور باہر چلا گیا۔

منی کو بہت زکام تھا۔ ناک بہت بری طرح بہ رہی تھی۔ نذیر نے کریم کو بلایا اور اس کو پانچ کاونٹ دے کر کہا۔ ”جاؤ ایک وکس کی بوتل لے آؤ۔“

کریم نے پوچھا۔ ”وہ کیا ہوتی ہے؟“

نذیر نے اس سے کہا۔ ”زکام والی دوا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک پرزے پر اس دوا کا نام لکھ دیا۔ ”کسی بھی سنور سے مل جائے گی۔“ ”جی اچھا“ کہہ کر کریم چلا گیا۔ نذیر منی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ منی خوش شکل نہیں تھی لیک کم سنی کے باعث نذیر کے لیے دلکش تھی۔ اس نے اس کو گود میں لے لیا۔ ماں سے سو نہیں رہی تھی۔ سر میں ہولے ہولے انگلیاں پھیر کر اس کو سلا دیا اور شاردہ سے کہا۔ ”اس کی ماں تو میں ہوں۔“

شاردہ مسکرائی۔ ”لائیے میں اس کو اندر چھوڑ آؤں۔“

شاردہ اس کو اندر لے گئی اور چند منٹ کے بعد واپس آگئی۔ اب اس کے چہرے پر غصے کے آثار نہیں تھے۔ نذیر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے شاردہ سے پوچھا۔ ”کیا آپ مجھے اپنا پتی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں؟“ اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ شاردہ نے غصے کا اظہار نہ کیا۔ ”جواب دیجئے جناب!“

شاردہ خاموش رہی۔ نذیر نے اٹھ کر پیگ پیا تو شاردہ نے ناک سکوڑ کر اس سے کہا۔ ”مجھے اس چیز سے نفرت ہے۔“

نذیر نے ایک پیگ گلاس ڈالا۔ اس میں سوڈا اعل کر کے اٹھایا اور شاردہ کے پاس بیٹھ گیا۔ ”آپ کو اس سے نفرت ہے، کیوں؟“

شاردہ نے مختصر سا جواب دیا۔ ”بس ہے۔“

”تو آج سے نہیں رہے گی۔ یہ لیجئے۔“ یہ کہہ کر اس نے گلاس شاردہ کی طرف بڑھا دیا۔

”میں ہرگز نہیں پیوں گی۔“

”میں کہتا ہوں، تم ہرگز انکار نہیں کرو گی۔“

21

شاردا نے گلاس پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر تک عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر نذیر کی طرف مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا اور ناک انگلیوں سے بند کر کے سارا گلاس غناغٹ پی گئی۔ قے آنے کو تھی مگر اس نے روک لی۔ دھوتی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ کر اس نے نذیر سے کہا۔

”یہ پہلی اور آخری بار ہے۔ لیکن میں نے کیوں پی؟“

نذیر نے اس کے گیلے ہونٹ چومے اور کہا۔ ”یہ مت پوچھو۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

شام کو سات بجے اس نے دروازہ کھولا۔ کریم آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر چلی گئی۔ کریم بہت خوش تھا۔ اس نے نذیر سے کہا۔

”آپ نے کمال کر دیا۔ آپ سے سو تو نہیں مانگتا، پچاس دے دیجئے۔“

نذیر، شاردا سے بے حد مطمئن تھا۔ اس قدر مطمئن کہ وہ گزشتہ تمام عورتوں کو بھول چکا تھا۔ وہ اس کے جنسی سوالات کا سو فیصد صحیح جواب

تھی۔ اس نے کریم سے کہا۔ ”میں کل ادا کروں گا۔ ہوٹل کا کرایہ بھی کل چکاؤں گا۔ آج میرے پاس وہ سکی منگانے کے بعد صرف دس

روپے باقی تھے۔“

کریم نے کہا۔ ”کوئی واندہ نہیں۔۔۔۔۔۔ میں تو اس بات سے بہت خوش ہوں کہ آپ نے شاردا سے معاملہ طے کر لیا۔ حضور!

میری جان کھا گئی تھی۔ اب شکنتلا سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

کریم چلا گیا، شاردا آئی۔ اس کی گود میں مٹی تھی۔ نذیر نے اس کو پانچ روپے دیئے لیکن شاردا نے انکار کر دیا۔ اس پر نذیر نے اس

سے مسکرا کر کہا۔ ”میں اس کا باپ ہوں، تم یہ کیا کر رہی ہو۔“

شاردا نے روپے لے لیے بڑی خاموشی کے ساتھ۔ شروع شروع میں وہ بہت باتوں کی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ باتوں کے دریا بہا

دے گی۔ مگر اب وہ بات کرنے سے گریز کرتی تھی۔ نذیر نے اس کی بیٹی کو گود میں لے کر پیار کیا اور جاتے وقت شاردا سے کہا۔ ”لو بھی

شاردا، میں چلا۔ کل نہیں تو پرسوں ضرور آؤں گا۔“

لیکن نذیر دوسرے روز ہی آ گیا۔ شاردا کے جسمانی خلوص نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ اس نے کریم کو پچھلے روپے ادا کئے۔ ایک

بوتل منگوائی اور شاردا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کو پینے کے لیے کہا تو وہ بولی۔ ”میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلا اور آخری گلاس تھا۔“

نذیر اکیلا پیتا رہا۔ صبح گیارہ بجے سے وہ شام سات بجے تک ہوٹل کے اس کمرے میں شاردا کے ساتھ رہا۔ جب گھر لوٹا، وہ بے حد

مطمئن تھا، پہلے روز سے بھی زیادہ مطمئن۔ شاردا اپنی واجبی شکل و صورت اور کم گوئی کے باوجود اس کے شہوانی حواس پر چھا گئی تھی۔ نذیر بار

بار سوچتا تھا۔ ”یہ کیسی عورت ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی خاموش، مگر جسمانی طور پر ایسی پرگو عورت نہیں دیکھی۔“

نذیر نے ہر دوسرے دن شارددا کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اس کو روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نذیر ہلکے روپے کریم کو دیتا تھا۔ دس روپے ہوٹل والے جاتا تھا۔ باقی بچاس میں سے تقریباً تیرہ روپے کریم اپنی کمیشن وضع کر لیتا تھا۔ مگر شارددا نے اس کے متعلق نذیر سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔

دو مہینے گزر گئے۔ نذیر کے بجٹ نے جواب دے دیا۔ اس کے علاوہ اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ شارددا اس کی ازدواجی زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو رہی ہے۔ وہ بیوی کے ساتھ سوتا ہے تو اس کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے بجائے شارددا ہو۔ یہ بہت بری بات ہے۔ نذیر کو چونکہ اس کا احساس تھا اس لیے اس نے کوشش کی کہ شارددا کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شارددا ہی سے کہا۔ ”شارددا میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میری جتنی جمع پونجی تھی ختم ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ حالانکہ چاہتا ہوں کہ ادھر کا کبھی رخ نہ کروں۔“

شارددا نے یہ سنا تو خاموش ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ ”جتنے روپے میرے پاس ہیں آپ لے سکتے ہیں۔ صرف مجھے جے پور کا کرایہ دے دیجئے تاکہ میں شکستہ کو لے کر واپس چلی جاؤں۔“

نذیر نے اس کا پیار لیا اور کہا۔ ”بکو اس نہ کرو تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ بات یہ ہے کہ میرا روپیہ بہت خرچ ہو گیا بلکہ یوں کہو کہ ختم ہو گیا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہارے پاس کیسے آسکوں گا۔“

شارددا نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر ایک دوست سے قرض لے کر جب دوسرے روز ہوٹل میں پہنچا تو کریم نے بتایا کہ وہ جے پور جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ نذیر نے اس کو بلایا۔ مگر وہ نہ آئی۔ کریم کے ہاتھ اس نے بہت سے نوٹ بھجوائے اور یہ کہا۔ ”آپ یہ روپے لے لیجئے۔۔۔۔۔ اور مجھے اپنا ایڈریس دے دیجئے۔“

نذیر نے کریم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا اور روپے واپس کر دیئے۔ شارددا آئی۔ گود میں منی تھی۔ اس نے آداب عرض کیا اور کہا۔ ”میں آج شام کو جے پور جا رہی ہوں۔“

نذیر نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

شارددا نے مختصر جواب دیا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔“ اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

نذیر نے کریم سے کہا کہ اسے بلا کر لائے۔ مگر وہ نہ آئی۔ نذیر چلا گیا۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے بدن کی حرارت چلی گئی ہے۔ اس کے سوال کا جواب چلا گیا ہے۔

وہ چلی گئی واقعی چلی گئی۔ کریم کو اس کا بہت افسوس تھا۔ اس نے نذیر سے شکایت کے طور پر کہا۔

□

”جے پور۔۔۔۔۔ پرے نذیر صاحب!“

اتنا پڑھ کر وہ رک گئی۔ نذیر چونکا۔ نعیمہ نے ایک سطر اور پڑھی۔

”آداب! آپ تو مجھے بھول چکے ہوں گے مگر جب سے میں یہاں آئی ہوں آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں۔“

نعیمہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے کاغذ کا دوسرا رخ دیکھا۔ ”کوئی شاردا ہے۔“

نذیر اٹھا، جلدی سے اس نے نعیمہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اپنی بیوی سے کہا۔ ”خدا معلوم کون ہے؟۔۔۔۔۔ میں باہر جا رہا ہوں۔“

اس کو پڑھا کر اردو میں لکھوالاؤں گا۔“

اس نے بیوی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور چلا گیا۔ ایک دوست کے پاس جا کر اس نے شاردا کے خط جیسے کاغذ منگوائے اور ہندی

میں ویسی ہی روشنائی سے ایک خط لکھوایا۔ پہلے فقرے وہی رکھے۔ مضمون یہ تھا کہ بہیمی سنٹرل پر شاردا اس سے ملی تھی۔ اس کو اتنے بڑے

مصور سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی، وغیرہ وغیرہ۔

شام کو گھر آیا تو اس نے نیا خط اپنی بیوی کو دیا اور اردو کی نقل پڑھ کر سنادی۔ بیوی نے شاردا کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے

کہا۔ ”عرصہ ہوا ہے میں ایک دوست کو چھوڑنے گیا تھا۔ شاردا کو یہ دوست جانتا تھا۔ وہاں پلیٹ فارم پر میرا تعارف ہوا۔ مصوری کا اسے

بھی شوق تھا۔“

بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن دوسرے روز شاردا کا ایک اور خط آ گیا۔ اس کو بھی نذیر نے اسی طریقے سے گول کیا اور فوراً شاردا کو تار دیا کہ

وہ خط لکھنا بند کر دے اور اس کے نئے پتے کا انتظار کرے۔ ڈاک خانے جا کر اس نے متعلقہ پوسٹ مین کو تاکید کر دی کہ جے پور کا خط وہ

اپنے پاس رکھے صبح آ کر وہ اس سے پوچھ لیا کرے گا۔ تین خط اس نے اس طرح وصول کئے۔ اس کے بعد شاردا اس کو اس کے دوست

کے پتے پر خط بھیجنے لگی۔

شاردا بہت کم گوتھی، لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی۔ اس نے نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن خط اس اظہار سے پر

ہوتے تھے۔ گلے شکوے، ہجر و فراق، اس قسم کی عام باتیں جو عشقیہ خطوں میں ہوتی ہیں۔ نذیر کو شاردا سے وہ محبت نہیں تھی۔ جس کا ذکر

افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جواب کیا لکھے اس لیے یہ کام اس کا دوست ہی کرتا تھا۔ ہندی

میں جواب لکھ کر وہ نذیر کو سنا دیتا اور نذیر کہہ دیتا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔“

شاردا بہیمی آنے کے لیے بے قرار تھی لیکن وہ کریم کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ نذیر اس کی رہائش کا اور کہیں بندوبست نہیں کر سکتا تھا

کیونکہ مکان ان دنوں ملتے ہی نہیں تھے۔ اس نے ہوٹل کا سوچا، مگر خیال آیا، ایسا نہ ہو راز فاش ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شاردا کو لکھوایا کہ

ابھی کچھ دیر انتظار کرے۔

21

اتنے میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ بنوارے سے پہلے عجیب افراتفری مچی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ لاہور جانا چاہتی ہے۔ ”میں کچھ دیر وہاں رہوں گی، اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس آ جاؤں گی ورنہ آپ بھی وہیں چلے آئیے گا۔“

نذیر نے کچھ دیر اسے روکا مگر جب اس کا بھائی لاہور جانے کے لیے تیار ہوا تو وہ اور اس کی بہن اس کے ساتھ چلی گئیں اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اس نے شاردا کو سرسری طور پر لکھا کہ وہ اب اکیلا ہے۔ جواب میں اس کا تارا آیا کہ وہ آرہی ہے۔ اس تار کے مضمون کے مطابق وہ بے پور سے چل پڑی تھی۔ نذیر بہت شپٹا یا مگر اس کا جسم بہت خوش تھا۔ وہ شاردا کے جسم کا خلوص چاہتا تھا۔ وہ دن پھر سے مانگتا تھا، جب وہ شاردا کے ساتھ چٹا ہوتا تھا، صبح گیارہ بجے سے لے کر شام سات بجے تک۔ اب روپے کے خرچ کا سوال نہیں تھا۔ کریم بھی نہیں تھا۔ ہوٹل بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا۔ ”میں اپنے نوکر کو رازدار بنا لوں گا، سب ٹھیک ہو جائے گا، دس پندرہ روپے اس کا منہ بند کر دیں گے۔ میری بیوی واپس آئی تو وہ اس سے کچھ نہیں کہے گا۔“

دوسرے روز وہ اسٹیشن پہنچا۔ فرنیر میل آئی، مگر شاردا تلاش کے باوجود اسے نہ ملی۔ اس نے سوچا، شاید کسی وجہ سے رک گئی ہے، دوسرا تاریخ بھیجے گی۔

اس سے اگلے روز وہ حسب معمول صبح کی ٹرین سے اپنے دفتر روانہ ہوا۔ وہ مہا لکشمی اترتا تھا۔ گاڑی وہاں رکی تو اس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر شاردا کھڑی ہے۔ اس نے زور سے پکارا۔ ”شاردا“
شاردا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”نذیر صاحب“
”تم یہاں کہاں؟“

شاردا نے شکایتا کہا۔ ”آپ مجھے لینے نہ آئے تو میں یہاں آپ کے دفتر پہنچی۔ پتہ چلا کہ آپ ابھی تک نہیں آئے۔ یہاں پلیٹ فارم پر اب آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

نذیر نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا۔ ”تم یہاں ٹھہرو، میں دفتر سے چھٹی لے کر ابھی آتا ہوں۔“
شاردا کو بیچ پر بٹھا کر نذیر جلدی جلدی دفتر گیا۔ ایک عرضی لکھ کر وہاں چڑھایا اور شاردا کو اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں دونوں نے کوئی بات نہ کی، لیکن ان کے جسم آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف کھینچتے رہے۔
گھر پہنچ کر نذیر نے شاردا سے کہا۔ ”تم نہالو، میں ناشتے کا بندوبست کراتا ہوں۔“

شاردا انہاں نے لگی۔ نذیر نے نوکر سے کہا۔ ”کہ اس کے دوست کی بیوی آئی ہے، جلدی سے ناشتہ تیار کر دے۔ اس سے یہ کہہ کر نذیر

نے الماری سے بوتل نکالی۔ ایک پیگ جو دو کے برابر تھا، گلاس میں انڈیلا اور پانی ملا کر پی گیا۔
وہ اسی ہوٹل والے ڈھنگ سے شاردا سے اختلاط چاہتا تھا۔

شاردا نہادھو کر باہر نکلی اور ناشتہ کرنے لگی۔ اس نے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کیں۔ نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بدل گئی ہے۔ وہ پہلے بہت کم گوئی، اکثر خاموش رہتی تھی، مگر اب وہ بات بات پر اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی۔ نذیر نے سوچا۔ ”یہ محبت کیا ہے۔۔۔۔۔۔ اگر یہ اس کا اظہار نہ کرے تو کتنا اچھا ہے۔ مجھے اس کی خاموشی زیادہ پسند تھی۔ اس کے ذریعے مجھ تک بہت سی باتیں پہنچ جاتی تھیں۔ مگر اب اس کو جانے کیا ہو گیا ہے، باتیں کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے عشقیہ خط پڑھ کر سنا رہی ہے۔“

ناشتہ ختم ہوا تو نذیر نے ایک پیگ تیار کیا اور شاردا کو پیش کیا، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ نذیر نے اصرار کیا تو شاردا نے اس کو خوش کرنے کی خاطر ناک بند کر کے وہ پیگ پی لیا۔ براسا منہ بنایا۔ پانی لے کر کھلی کی۔ نذیر کو افسوس سا ہوا کہ شاردا نے کیوں پی۔ اس کے اصرار پر بھی انکار کیا ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ مگر اس نے اس کے بارے میں زیادہ غور نہ کیا۔ نوکر کو بہت دور ایک کام سے بھیج دیا۔ دروازہ بند کیا اور شاردا کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔

”تم نے لکھا تھا کہ وہ دن پھر کب آئیں گے۔ لو آگئے ہیں پھر وہی دن، بلکہ راتیں بھی۔ ان دنوں راتیں نہیں ہوتی تھیں، صرف دن ہوتے تھے۔ ہوٹل کے میلے کھیلے دن۔ یہاں ہر چیز اچلی ہے۔ ہر چیز صاف ہے۔ ہوٹل کا کرایہ بھی نہیں، کریم بھی نہیں، یہاں ہم اپنے مالک آپ ہیں۔“

شاردا نے اپنے فراق کی باتیں شروع کر دیں۔ یہ زمانہ اس نے کیسے کاٹا۔ وہی کتابوں اور افسانوں والی فضول باتیں، گلے شکوے، آہیں، راتیں تارے گن گن کر کاٹنا۔ نذیر نے ایک پیگ اور پیا اور سوچا۔ ”کون تارے گنتا ہے، گن کیسے سکتا ہے اتنے سارے تاروں کو۔۔۔۔۔۔ بالکل فضول ہے، بے ہودہ ہے، بکو اس ہے۔“

یہ سوچتے ہوئے اس نے شاردا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ بستر صاف تھا، شاردا صاف تھی، وہ خود صاف تھا، کمرے کی فضا بھی صاف تھی۔ لیکن کیا وجہ تھی کہ نذیر کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی جو اس غلیظ ہوٹل میں لوہے کی چارپائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔

نذیر نے سوچا، شاید اس نے کم پی ہے۔ اٹھ کر اس نے ایک پیگ بنایا اور ایک ہی دفعہ میں ختم کر کے شاردا کے ساتھ لیٹ گیا۔ شاردا سے پھر وہی لاکھ مرتبہ کہی ہوئی باتیں شروع کر دیں۔ وہی جبر و فراق کی باتیں۔ وہی گلے شکوے۔ نذیر اکتا گیا، اور اس اکتاہٹ نے اس کے جسم کو کند کر دیا۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ شاردا کی سان گھس کر بے کار ہو گئی ہے۔ اس کے جسم کے جذبات کو اب وہ تیز نہیں کر سکتی۔ لیکن

وہ پھر بھی اس کے ساتھ دیر تک لیٹا رہا۔

21

فارغ ہوا تو اس کا جی چاہا کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے اپنی بیوی کے پاس۔ مگر جب اس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے اور اس کی بیوی لاہور میں، تو دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا۔ اس کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کا گھر ہوٹل بن جائے۔

شاردا کے جسم کا خلوص بدستور برقرار تھا، مگر وہ فضا نہیں تھی۔ وہ سودے بازی نہیں تھی۔ اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والی بات نہیں تھی۔ ہوٹل کی وہ غلاظت نہیں تھی۔ یہ سب چیزیں مل ملا کر وجہ ایک ماحول بناتی تھیں، وہ نہیں تھا۔ نذیر اپنے گھر میں تھا۔ اس بستر پر تھا جس پر اس کی سادہ لوح بیوی اس کے ساتھ سوتی تھی۔ یہ احساس اس کے تحت الشعور میں تھا، اس لیے وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ کبھی وہ یہ سوچتا کہ وہ کی خراب ہے، کبھی وہ سوچتا کہ شاردا نے التفات نہیں برتا۔ اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ وہ خاموش رہتی تو سب ٹھیک ہوتا۔ پھر وہ یہ سوچتا کہ اتنی دیر کے بعد ملی ہے، دل کی بھڑاس تو نکالنا ہی تھی بے چاری کو۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی، وہی پرانی شاردا بن جائے گی۔

پندرہ دن گزر گئے، مگر نذیر کو شاردا وہ پرانی ہوٹل والی شاردا محسوس نہ ہوئی۔ اس کی بچی جے پور میں تھی، ہوٹل میں وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ نذیر اس کے زکام کے لیے اس کی بھینسوں کے لیے اس کے گلے کے لیے دو ایمس منگوا یا کرتا تھا۔ اب یہ چیز نہیں تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ نذیر اس کو اور اس کی منی کو بالکل ایک سمجھتا تھا۔

ایک بار شاردا کی دودھ بھری چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چٹ گئے تھے۔ اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی۔ اس نے سوچا تھا، ماں بننا کتنا اچھا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ دودھ۔ مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھاپی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔ عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں۔ کسی کو پالنا، اپنے بچے ہی سہی، کتنی شاندار چیز ہے۔

اب منی، شاردا کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ نامکمل تھی۔ اس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں۔ اب ان میں دودھ نہیں تھا۔ وہ سفید سفید آب حیات۔ نذیر اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھیچتا تھا، وہ اس کو منع نہیں کرتی تھی۔ شاردا، اب شاردا نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاردا وہی شاردا تھی، بلکہ اس سے کچھ زیادہ تھی۔ یعنی اتنی دیر جدا رہنے کے بعد اس کا جسمانی خلوص تیز ہو گیا تھا، وہ روحانی طور پر بھی نذیر کو چاہتی تھی۔ لیکن نذیر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاردا میں اب وہ پہلی سی کشش یا جو کچھ تھا، نہیں رہا۔

پندرہ دن لگاتار اس کے ساتھ گزارنے پر وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ پندرہ دن دفتر سے غیر حاضری بہت کافی تھی۔ اس نے اب دفتر جانا شروع کر دیا۔ صبح اٹھ کر دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ شاردا نے بالکل بیویوں کی طرح اس کی خدمت کرنا شروع کر دی۔ بازار سے اون خرید کر اس کے لیے سویٹر بن دیا۔ شام کو دفتر سے آتا تو اس کے لیے سوڈے منگوا کر رکھے ہوتے۔ برف تھوموس میں ڈالی ہوتی۔ صبح اٹھ کر اس کا شیو کا سامان میز پر رکھتی۔ پانی گرم کر کے اس کو دیتی۔ وہ شیو کر چکتا تو سارا سامان صاف کرتی۔ گھر کی صفائی کراتی۔ خود جھاڑو دیتی۔ نذیر

اور بھی زیادہ اکتا گیا۔

□

رات کو وہ اکٹھے سوتے تھے۔ مگر اب اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے اس لیے اکیلا سونا چاہتا ہے۔ شاردا دوسرے پلنگ پر سونے لگی۔ مگر یہ نذیر کے لیے ایک اور الجھن ہو گئی۔ وہ گہری نیند سوئی ہوتی، اور وہ جاگتا رہتا اور سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا۔ یہ شاردا یہاں کیوں ہے؟۔۔۔۔۔۔۔۔ کریم کے ہوٹل میں اس نے اس کے ساتھ چند دن بڑے اچھے گزارے تھے، مگر یہ اس کے ساتھ کیوں چٹ گئی ہے۔ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ محبت وغیرہ بکو اس ہے۔ جو ایک چھوٹی سی بات ہے، وہ اب نہیں رہی۔ اس کو واپس جے پور جانا چاہیے۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ وہ کریم کے ہوٹل میں بھی کرتا تھا۔ اس نے شادی سے پہلے بھی ایسے بے شمار گناہ کئے تھے مگر ان کا اس کو احساس ہی نہیں تھا، لیکن اب اس نے بڑی شدت سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے۔ اپنی سادہ لوح بیوی سے جس کو اس نے کئی بار شاردا کے خطوں کے سلسلے میں چکمہ دیا تھا۔ شاردا اب اور بھی زیادہ بے کشش ہو گئی۔ وہ اس سے روکھا برتاؤ کرنے لگا، مگر اس کے التفات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ آرٹسٹ لوگ موجی ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اس سے اس کی بے التفاتی کا گلہ نہیں کرتی تھی۔ پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ جب نذیر نے دن گئے تو اس کو بہت الجھن ہوئی۔ ”یہ عورت کیا پورا ایک مہینہ یہاں رہی ہے۔ میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں۔ اور ادھر ہر روز میں اپنی بیوی کو ایک خط لکھتا ہوں جیسے بڑا وفادار شوہر ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسے مجھے اس کا بہت خیال ہے۔ جیسے اس کے بغیر میری زندگی اجیرن ہے۔ میں کتنا بڑا فراڈ ہوں۔ ادھر اپنی بیوی سے غداری کر رہا ہوں، ادھر شاردا سے۔ میں کیوں اس سے صاف صاف نہیں کہہ دیتا کہ بھیجی اب مجھے تم سے لگاؤ نہیں رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے لگاؤ نہیں رہا یا شاردا میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی؟“

وہ اس کے متعلق سوچتا مگر اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اس کے ذہن میں عجیب افرا تفری پھیلی تھی۔ وہ اب اخلاقیات کے متعلق سوچتا تھا۔ بیوی سے جو وہ غداری کر رہا تھا، اس کا احساس ہر وقت اس پر غالب رہتا تھا۔ کچھ دن اور گزرے تو یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہو گیا اور نذیر کو خود سے نفرت ہونے لگی۔ ”میں بہت ذلیل ہوں۔ یہ عورت میری دوسری بیوی کیوں بن گئی ہے۔ مجھے اس کی کب ضرورت تھی۔ یہ کیوں میرے ساتھ چپک گئی ہے۔ میں نے کیوں اس کو یہاں آنے کی اجازت دی، جب اس نے تار بھیجا۔ لیکن وہ تار ایسے وقت پر ملا تھا کہ میں اس کو روک ہی نہیں سکتا تھا۔“

پھر وہ سوچتا کہ شاردا جو کچھ کرتی ہے، بناوٹ ہے۔ وہ اس کو اس بناوٹ سے اپنی بیوی سے جدا کرنا چاہتی تھی۔ اس سے اس کی نظروں میں شاردا اور بھی گر گئی۔ اس سے نذیر کا سلوک اور زیادہ روکھا ہو گیا۔

اس روکھے پن کو دیکھ کر شاردا بہت زیادہ ملائم ہو گئی۔ اس نے نذیر کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ لیکن نذیر کو

اس کے اس رویے سے بہت الجھن ہوئی۔ وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگا۔

21

ایک دن اس کی جیب خالی تھی۔ پینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے تھے۔ دفتر بہت دیر سے گیا اس لیے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جاتے وقت شاردا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اس پر برس پڑا۔ ”بکو اس نہ کرو میں ٹھیک ہوں۔ پینک سے روپے نکلوانے بھول گیا ہوں اور سگریٹ میرے سارے ختم ہیں۔“

دفتر کے پاس دکان سے اس کو گولڈ فلک کا ڈبہ ملا۔ یہ سگریٹ اس کو ناپسند تھے مگر ادھار مل گئے تھے اس لیے دو تین مجبوراً پینے پڑے۔ شام کو گھر آیا تو دیکھا کہ تپائی پر اس کا من بھاتا سگریٹ کا ڈبہ پڑا ہے۔ خیال کیا کہ خالی ہے۔ پھر سوچا کہ شاید ایک دو اس میں پڑے ہوں۔ کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔

شاردا سے پوچھا۔ ”یہ ڈبہ کہاں سے آیا؟“

شاردا نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اندر الماری میں پڑا تھا۔“

نذیر نے کچھ نہ کہا۔ اس نے سوچا شاید میں نے کھول کر اندر الماری میں رکھ دیا تھا اور بھول گیا۔ لیکن دوسرے دن پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا۔ نذیر نے جب شاردا سے اس کی بابت پوچھا تو اس نے مسکرا کر وہی جواب دیا۔ ”اندر الماری میں پڑا تھا۔“

نذیر نے بڑے غصے کے ساتھ کہا۔ ”شاردا تم بکو اس کرتی ہو تمہاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں۔ میں اپنی چیزیں خود خرید سکتا ہوں۔ میں بھکاری نہیں ہوں جو تم میرے لیے ہر روز سگریٹ خرید کر دو۔“

شاردا نے بڑے پیار سے کہا۔ ”آپ بھول جاتے ہیں اسی لیے میں نے دو مرتبہ گستاخی کی۔“

نذیر نے بے وجہ اور زیادہ غصہ سے کہا۔ ”میرا دماغ خراب ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں۔“

شاردا کا لہجہ بہت ہی ملائم ہو گیا۔ ”میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“

نذیر نے ایک لفظ کے لیے خیال کیا کہ شاردا کی کوئی غلطی نہیں۔ اسے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لینا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ اس کا اتنا خیال رکھتی تھی۔ مگر فوراً ہی اس کو اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ غداری کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے شاردا سے بڑے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”بکو اس نہ کرو میرا خیال ہے کہ تمہیں کل یہاں سے روانہ کر دوں۔ کل صبح تمہیں جتنے روپے درکار ہوں دے دوں گا۔“

شاردا نے کچھ نہ کہا۔ رات کو وہ نذیر کے ساتھ سوئی۔ ساری رات وہ اس سے پیار کرتی رہی۔ نذیر کو اس سے الجھن ہوتی رہی، مگر اس نے شاردا پر اس کا اظہار نہ کیا۔ صبح اٹھا تو ناشتے پر بے شمار لذیذ چیزیں تھیں۔ پھر بھی اس نے شاردا سے کوئی بات نہ کی۔ فارغ ہو کر وہ سیدھا پینک گیا۔ جانے سے پہلے اس نے شاردا سے صرف اتنا کہا۔ ”میں پینک جا رہا ہوں ابھی واپس آتا ہوں۔“